

تحریک آزادی ہند

اور

مسلمان

حصہ دوم

”جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اور اضافی پر مشتمل ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۳۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طالع: _____ رانا اللہ داد خاں، مینجنگ ڈائریکٹر

ناشر: _____ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبع: _____ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

اشاعت:

۹ تا ۹ مئی ۱۹۷۳ء تا اکتوبر ۱۹۸۹ء ۹۵۰۰

۱۰ جنوری ۱۹۹۶ء ۵۰۰

(قیمت ۹۰/- ہے)

فہرست مضامین

۹	مقدمہ پان اول (فروری ۱۹۴۱ء)
۱۷	تعارف مقصد (جولائی ۱۹۳۹ء)
۲۹	تحریک اسلامی کا تنزل (نومبر ۳۹ء)
۴۹	نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں (مئی ۱۹۳۹ء)
۶۳	اقلیت و اکثریت (جون ۱۹۳۹ء)
۶۹	شکایات (دسمبر ۱۹۳۹ء)
۸۱	راہ رو پشت بمنزل (جنوری ۱۹۴۰ء)
۹۳	اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین (مئی و جون ۱۹۴۰ء)
۱۰۹	اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل (جولائی ۱۹۴۰ء)
۱۲۱	اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں (محرم ۴۰ھ - جنوری ۱۹۴۱ء)
۱۶۱	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ (ستمبر ۱۹۴۰ء)
۲۰۱	ایک صانع جماعت کی ضرورت (اپریل ۱۹۴۱ء)

اضافے

۲۱۵	مطالبہ پاکستان کو یہود کے قومی وطن سے تشبیہ دینا غلط ہے (ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۴ء)
۲۱۷	مسلم لیگ سے اختلافات کی نوعیت (ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۴ء)

- ۲۲۵ وقت کے سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک (ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء)
- ۲۲۹ نظام کفر کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ (محرم ۶۵ - دسمبر ۱۹۴۵ء)
- ۲۳۳ مجالس قانون سازی کی کیفیت شرعی نقطہ نظر سے (محرم ۶۵ - دسمبر ۱۹۴۵ء)
- ۲۳۷ پُر امن انقلاب کا راستہ (محرم ۶۵ - دسمبر ۱۹۴۵ء)
- ۲۴۱ ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور جماعت اسلامی (فروری ۱۹۴۶ء)
- ۲۴۱ تقسیم سے قبل ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ (اپریل ۱۹۴۷ء)
- ۲۸۷ صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں جماعت اسلامی کا مسلک (جولائی ۱۹۴۷ء)
- ۲۸۹ تقسیم ہند کے حالات پر تبصرہ (جون ۱۹۴۸ء)
- ۳۰۱ تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ (جولائی ۱۹۴۸ء)
- ۳۱۳ تقسیم کے بعد سامنے آنے والے اہم مسائل (اگست ۱۹۴۸ء)
- ۳۲۷ کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے (مئی ۱۹۴۸ء)
- ۳۳۵ پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نہیں نافذ ہو سکتا؟ (جنوری ۱۹۴۸ء)
- ۳۶۵ پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ (فروری ۱۹۴۸ء)
- ۳۸۳ مطالبہ نظام اسلامی (اپریل و مئی ۱۹۴۸ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

میری اس کتاب کا حصہ اول اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے جو دراصل تین اجزاء پر مشتمل تھا۔

۱۔ میرے وہ مضامین جو ۱۹۲۷ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول" کے نام سے ابتداء شائع ہوئے تھے اور پھر ایک مدت تک اسی نام سے کتابی صورت میں شائع ہوتے رہے۔

۲۔ وہ مضامین جو میں نے ۱۹۲۸ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" کے نام سے شائع کیے تھے اور وہ بھی ایک مدت تک اسی نام سے شائع ہوتے رہے۔

۳۔ میری کتاب "مسئلہ قومیت" کے بعض حصے جو ۱۹۲۹ء میں لکھے گئے تھے۔ ان سب کا موضوع ہندوستان کے مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنا تھا جو ملک کے تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے ایک لادینی جمہوری قومی ریاست میں ضم کر دینے سے ان کے دین، ان کی تہذیب اور ان کی انفرادیت کو لاحق ہو سکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے اور حالات بدل گئے ہیں، لیکن بہر حال ان مضامین کی ایک تاریخی اہمیت تھی، اس لیے ان کو تحریک آزادی ہند اور مسلمان "حصہ اول" کے نام سے از سر نو شائع کیا گیا۔

اب اسی کتاب کا یہ دوسرا حصہ شائع کیا جا رہا ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے :

۱۔ میرے وہ مضامین جو مئی ۱۹۳۹ء سے اپریل ۱۹۴۱ء تک لکھے گئے تھے اور مسلمان اور موجودہ

سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے اُسی زمانے میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ہر
مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا بات
کن حالات میں کہی گئی تھی۔

۲۔ وہ مضامین جو سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اشاعت کے بعد اسی موضوع سے تعلق رکھنے
والے مسائل پر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک لکھے گئے۔ یہ سب مضامین اگرچہ رسالہ
ترجمان القرآن میں اپنے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے تھے لیکن ان کو کہیں یکجا
مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان کو مرتب کر کے اس کتاب میں اُن کا اضافہ کر دیا
گیا ہے، امدان میں سے بھی ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے تاکہ ہر
بات کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکے۔

چونکہ یہ مضامین ————— خصوصاً اس کتاب کے جز و اول کے مضامین —————

برسوں سے میرے خلاف مہاذانہ پروپیگنڈے کے لیے خوب خوب استعمال ہوتے ہیں
امدان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے عجیب عجیب معنی پہناتے جلاتے ہیں
ہیں، اس لیے میں نے ترتیب و نظر ثانی کے وقت ان کی عبارات میں کوئی تغیر نہیں کیا
ہے۔ اگر کسی چیز کی تشریح کرنے یا کسی چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو
اسے حاشیہ کی صورت میں درج کیا ہے، امد قدیم و جدید حاشی کے درمیان فرق کرنے کے
لیے قوسین میں قدیم، یا جدید کے الفاظ لکھ دیئے ہیں تاکہ کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو، امد
کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ معترضین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے عبارتوں میں رد و بدل
کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں ۱۹۳۹ء سے
تقسیم ہند کے وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں سے کیا اہتمام ہوں، اور تقسیم
کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو میں نے اسلام کے اصل نصب العین کی طرف توجہ دلانے
کے لیے ۱۹۳۸ء میں کس طرح اپنی کوششوں کا آغاز کیا تقسیم کے بعد گزشتہ ۲۵ سال کے دوران میں
پیش آنے والے حالات کو نگاہ میں رکھ کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے اُس

وقت لکھا تھا وہ حق تھا یا نہیں۔ معترضین کے پیش کردہ اقتباسات، جو زیادہ تر سیاق و
 سباق سے الگ نکال کر اور تاریخی سیاق کو بھی نظر انداز کر کے پیش کیے گئے ہیں، کسی
 شخص کو صحیح اور منصفانہ رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ غیری اصل عبارتیں
 پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ بے کم دکا ست اس کتاب میں ناظرین کے سامنے موجود
 ہیں۔ انہیں پڑھیں اور جو رائے قائم کرنا چاہیں کریں۔

ابوالاعلیٰ

لاہور
 یکم نومبر ۱۹۷۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ طبع اول

”مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بلائی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جس کی توجیج یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا غلط فہمی پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے خورد تا مل سے ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور محسوس پییدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اُسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو

اے اب یہ دونوں مجموعے ”تحریک آزادی ہند اور مسلمان“ حصہ اول کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ”مسئلہ قومیت“ مستقل کتاب کی صورت میں بھی مل سکتی ہے (جدید)

اُس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اُس کو محض اپنے اہول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اُس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اُس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے، بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اُس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہر حال بیگانوں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ اُس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل اُن کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اُسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر اُن کے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے۔ اُن کی حیثیت اُس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی سر دست ہے اُس کو کم از کم اُسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر نہ ٹھہرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف ان کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوت عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے کے واسطے کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیش نظر تحریک اسلامی کا احیاء ہے اس لیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف اوپر

اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوتے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے۔ ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۳۷ میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اُس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو اندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجود نظامِ حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اُس کے پیچھے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقہ اثر میں ہیں اُن کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربطِ عوام (Mass Contact) کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور وِڈیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو جس چیز نے اور زیادہ پریشان کن بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ بااثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے

ملے میری کتاب "تنقیحات" اسی کوشش کا ایجنہ ہے۔ (قدیم)

نہ فرادہ ہے انگریزی حکومت جو اس وقت پر سیدہ صغیر ہندوستان پر مسلط تھی۔ (جدید)

۳۔ اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے میری کتاب "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" صفحہ اول

ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہذا اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے میں نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۲۷ کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۲۸ کے آغاز میں شائع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کہ از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اُس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، اُن آئینی تحفظات اور بنیادی حقوق کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اُس ٹھیک جمہوریت دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان کے سامنے ”سب سے بڑا دارالاسلام“ کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پر اگندگی اُن کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ بھی دور ہو اور اُن کو نظر جانے کے لیے ایک ایسا سطح نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اُس کی بلندی کو دیکھ کر ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومت خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصد احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کاتوں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ

لے مراد ہے علماء کا وہ گروہ جو اُس وقت کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا۔ (جدید)

مے یعنی ہندوستان اگر چہ دارالاسلام نہ بن سکے تو دارالاسلام سے مشابہ ایک ایسا ملک بن جائے جس میں ان کا اسلامی تشخص برقرار رہ سکے۔ (جدید)

سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوب اصل سے بحث کرنے کے بجائے حالت واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے داغ پر اگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی جھلانا تک میں مقصد بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصد قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں شامی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اس نتیجہ پر مطمئن ہونے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے انہی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انہوں نے سیکھے ہیں یا ان کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی سطح نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔

چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب پیش نہ آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے ساتھ دوسرا مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجبور کر دیا کہ پچھلے مجموعہ کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کر دوں جن کا مجموعہ اس وقت ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامہ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا اُسے میں تک ہوتا ہے اور اُس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک اصرار کیسے چلے جا رہے ہیں۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقف دین رہنماؤں پر نہیں جاتا تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی دجیسا کہ ٹرک کی اندامیران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ میرے نے اگر اپنی جو ہریت ہی کھو دی تو پھر جو ہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مل جائے۔

۱۔ یہ اُس وقت کی کیفیت تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

۲۔ یہ بات جب لکھی گئی تھی تو لوگوں کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ لیکن اب ۱۹۷۲ء کے

پاکستان میں جو حالت ہے اسے سب دیکھ رہے ہیں۔ (جدید)

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیہ دینی کے بجائے داعیہ قومی کو بہت زیادہ کار فرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے غلط نقطہ ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جذبہ اتنا کم اور قوم پرستانہ جذبہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جاتے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے ولیمند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہر حال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے ان کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا باعث نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو۔ لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو انہو کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں ان کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی

شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے
 تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر
 کہ کچھ ان کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے
 ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل،
 تو ایسے لوگوں کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا
 جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہموں گا۔

لاہور

ابوالاعلیٰ

محرم ۱۳۶۰ھ (فروری ۱۹۴۱ء)

تعارف مقصد

قوانین فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ ہوائِ
 سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اُسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت
 تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے ایسے جو قانون
 دنیا کے ایک حصہ میں ہے دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور
 نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ
 اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔
 اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہوجانے کے لیے
 جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رُورِ عایت
 کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی
 ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن
 نہیں۔ کسی پر ہربان اور کسی پر تاہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائیگا۔
 جو زہر کھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، قوت اور نشوونما پائے گا۔ فطرت
 کے حدود فرمانبرداری میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا
 شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی فطرت کا ایک رُخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرت کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ظلم اور دہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسباب سعادت اور اسباب شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائے گا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام اسلام ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا شیخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ کسی طبقاتی بیڈر کی فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطہ نظر سے نگاہ ڈالتا ہو۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا منقید ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان

یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور مسلمان اور
 اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو
 اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت،
 اخلاق اور مذہبیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں
 سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر
 مرحلے میں ان کی کامیابی مد نظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی
 طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے
 شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کرے ان کے مطابق
 عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی
 نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا،
 نقصان اٹھائے گا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیر نو کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے
 جو اسلام کی صداقت پر ایمان لاتے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اس لیے یہی
 ہماری تمام کوششوں کا مقصد اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام
 دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا
 ہے کہ جس طرح ہر جو شیعہ قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکین چاہتا ہے، اسی
 طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی "قوم"
 میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔
 یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے ہوئے تو مونجے اور ساوڑ کر بٹنے لے جرمی میں پیدا
 ہوتے ہوئے تو ہٹلر اور گورنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش

جست میں جنم لینے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ”دارالاسلام“ کو ”دارالمسلمین“ کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتہً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے ”دائرۃ اسلام“ میں داخل ہیں اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو ان کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ اتفاق سے اس کے حکمران کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں ”دارالاسلام“ کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا وکلاً، ہمارا نصب العین ایسی ”مسلمان حکومت“ کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسند حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرماں روائی کے تکبر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے اُسے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھہرائے گا، کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ
عِلْقًا فِي الْأَرْضِ وَلَا خِزْيًا (القصاص - ۸۳)

”آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انہی لوگوں کے لیے رکھا ہے

جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

دراصل جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلام کی حکومت ہے۔ اسی اسلام کی حکومت جو مجبوسہ ہے دیانت، اخلاق اور بدعتِ فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چار یا چھٹی بھی ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ سارے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں

اسلام چلا کر رہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب نوشی اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اُونچے سے اُونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ نظام تمدن کو اُن اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے منہر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے پاس آخر وہ خود اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اُس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی معاملات و تعلقات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حقہ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اُسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حب انسانیت یا حب وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے اپنے نوح یا اپنا سنے وطن کو اُس مسلک حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ اُن کی فلاح و بہبود اور کرامانی و خوش حالی مُضر دیکھتا ہے، اور اتنی ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ اُن مسلوں کی حکمرانی کا مخالفت ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات غلامتِ حب وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ غلامتِ حب وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمان داری کے ساتھ

موجب فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمان داری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو مغربی ڈیوکرسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیر نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی محنت اس کے سوا پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے ایمان و اعتقاد کا مقنا یہی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلافِ حبیبِ وطن یا خلافِ حبیبِ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راست بازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اُس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کر لیں جو ان کے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بد حالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوامِ عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راست باز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلوں کو چھوڑ کر اُس طریقہ کو قبول کر لیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیئے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا، ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اُس کے نظرِ سرِ حیات، اُس کے اصولِ اخلاق، اُس کے نظامِ تمدن، اُس کے قوانینِ معاشرت و معیشت، اُس کے

آئین سیاست و طرز حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعے اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development) (Social Justice) اور (Personality) کا پورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی صل (Social Justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اُسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی، روحانی اور مادی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے انسان کے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ المیہ ان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راست بازی کا تقاضا کیسے ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند انسانے جنس کے لیے ہے؟ جن مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے انسانے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق تنظیم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم مسلمان گھری پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے

دوسرے رفتار کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اُس بے روح مذہبیت کا قلاوہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اُسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج لمحوں اور لاندہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا ہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سر نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اُس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے روشناس کیا جیل کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے ہرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اُس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال و رتبہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظامِ اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس درحقیقت میں ایک تو مسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اُس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اُس نام نہاد

مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دُور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوتِ اس بات کی طرف ہے کہ آؤ اس ظلم و ظلمیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر سے انسان کی خدائی کو مٹادیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً دوڑ پڑھانے لگتا ہے **کوشش** (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرزِ حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو دونوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے بچ نہیں سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious) قوم اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں غرض مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط فائدوں نے تبلیغِ تبلیغ کا شور مچا دیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلتِ تعداد کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشنزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر ”اسلام ازم“ کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کی چکی ہے اور اس جمہوری دور میں قلیل القیاد ہونے کی وجہ سے اپنے دوڑ پڑھانا چاہتی ہے

تاکہ نامزدہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی گرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قوی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی رہی ہیں۔ شیطان راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہر حال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر و لگاؤ کا سعی اور خالصتہ توجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور ہنی نفع انسان کی غیر خواہی کے خوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اسلام کسی نسل اور قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور تقانون الہی کی اطاعت میں تم نسل مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدیم اور شرف تم کو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہو گے اور نسل مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دائمی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے خلیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ اسلام کی نوعیت اچھوت کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم بعض دوسری قوم کے دوش بڑھانے کے لیے اُس کی جُز و بنائی جاتے مگر زندگی کی متاع میں اسے برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ

۱۔ اچھوت قوموں کو پستی سے اٹھانے کی کوشش۔ (جدید)

۲۔ اُس زمانے میں ہندو لیڈروں نے یہ تحریک صرف اس لیے اٹھائی تھی کہ (باقی صفحہ ۲۷ پر)

اوصاف ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا اس کی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے گیر کٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اڑنے کی طاقت رکھتے ہو اڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک نگرہی و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کون سا موقع ہے؟

جو لوگ دوسے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں اور اس زمانہ کے حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور بڑھ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانہ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا ساتھ شک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت باسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانہ کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ سے) ہندوستان کے کرڈوں اچھوت کہیں ہندو قوم سے الگ نہ ہو جائیں لیکن ملّا ان مظلوم لوگوں کی جو حیثیت ہندو معاشرے میں تھی وہ بھوں کی توں رہی۔ (جدید)

وقتی اور مکانی حالات پر ہو، بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہر حال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہذا جو فطری اصول طوفانِ نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسیویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی ۵۰۰۰ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہو گا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلتے و آنے والے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہو گا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصول کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adapt) کرتا رہتا ہے۔

(ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۲۹ء)

تحریک اسلامی کا تنزیل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لئے کڑھتی ہے تو اس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اس کے اصول اپیل کرتے ہیں جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی اُتاد اس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُس کے دائرے میں اُن کے والے لاسے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی، نہ کوئی طاقت انہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے، جیسے کوئی کسی اندھے کو جھگل میں لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر، پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آجاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو وہ اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ ان

کے لیے اس تحریک کو چلانے کی کامیابی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز ان سے ان کا پھلا
 مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل
 ان کے قلب و روح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اس
 تحریک میں ان پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی ان کو اس تحریک کی طرف
 کھینچتا ہے۔ اور انکشاف حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اس مقام پر نہیں
 ٹھہرنے دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اس مقام کی
 طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ جدھر حق کی روشنی اسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ
 کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ
 بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور
 ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر
 دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار اپنی پوزیشن
 اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے
 خطرات تک پہنچے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات
 بدل جاتی ہیں، ان کے خصال میں تغیر آ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت،
 لباس، خوراک اور عام طرز زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ
 گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان
 کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدائی ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی
 ہے جو اسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی
 آدمیوں کی اس بھڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اپنے مطلب
 کے آدمی چھانٹتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے
 ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں

اُن کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اُسی مسلک پر اُٹھے جس کو خود انہوں نے حق
 پا کر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر
 کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق،
 عادات اور خصائل سب کے سب اُس مسلک کی رُوح اور اس کے اصولوں کے مطابق مصل
 جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔
 پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے
 ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ مگر فطرت،
 دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی اُفتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا
 جاتے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رنگ و نواں
 ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اُس تحریک کے ظہور کے وقت
 ہر طرح کے آدمی دنیا میں نمودار ہوتے، اور اُن سب نے اُس کو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ
 صرف وہی اس کی طرف بچنے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اُسی طرح
 بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے
 پیدا ہوں گے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ ان میں ابوجہل اور ابولہب
 بھی ہوں گے۔ عمر اور خالد بھی ہوں گے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح اُدھر کے گھر
 میں ابراہیمؑ حنیف پیدا ہو سکتا ہے، اُسی طرح نورؑ کے گھر میں "عمل غیر صالح" بھی پیدا
 ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اُس سوسائٹی سے
 باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی اُفتاد اور اپنی طبیعت کے رُخوان
 کے لحاظ سے اُس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں اور خود اُس کے اندر بہت سے آدمی
 ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت

۱۔ قرآن مجید میں حضرت نورؑ کے کافر بیٹے کو "عمل غیر صالح" قرار دیا گیا ہے۔

کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ ان کی پوری نئی پود کو ان کے مسلک کا حقیقی منبج بنا دے۔

اس خطرے کے سدِ باب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں، تکفیر کے ذریعہ سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو زنجان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اُسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیروں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دفتروں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں اُن میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی غلی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائش نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے

۱۔ موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو (Purge) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے غلامیہ مغرور ہونے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔ (قدیم)

سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اُس کے مسلک سے اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اُٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک اور اُن اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے بھندے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ عاجز اور کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت (Significance) کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر اُٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اُس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اُس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت

کھودینے کے بعد اب معنی ایک نسل و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مدینہ ہے کہ اسے ان مواقع پر یعنی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جلتے ہیں، جہاں اسلام کے بجا اس کے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جلیختے مسلمان زخمیاں، آپ کو کوٹھنوں پر بیٹھی نظرائیں گی اور "مسلمان زانی" گشت لگاتے ملیں گے، جیل خانوں کا محاسبہ کیجئے، مسلمان چوروں، مسلمان ڈاکوؤں، اور "مسلمان بد معاشوں" سے آپ کا تعاون ہو گا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خوردی، مجبوری شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاق جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا جو آپائیں گے۔ سوسائٹی میں پھر یہ ہے کہ آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہوگی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملیں گے کہیں "مسلمان سائندوں" اور "مسلمان گزروں" اور "مسلمان بھاٹیروں" سے آپ کو چار ہونگے۔ بھلا خود تو کیجئے، یہ لفظ "مسلمان" کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے اور کن کن مصافح کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اند زانی، مسلمان اور کشمیری، مسلمان اور تمار باز، مسلمان اور رشوت خور، اگر وہ سب کچھ جو ایک کافر کر سکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کر سکتے گے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بد اخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اُٹھی تھی۔ اس سننے تو مسلمان کے نام سے اُن پیسہ آدمیوں کی حاجت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاح اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس سننے اپنی حاجت میں ہتھ کاشت کی، پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی، کرڑے بڑے بڑے ساکر کھال اُڑا دینے کی، حتیٰ کہ گولی پر چڑھا دینے کی ہر ناک سترائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے نہ ناکو مٹا سکے اُٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جلتے ہیں کالام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خوردوں کے وجود سے خالی ہوا جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرتا ہے خود اس میں کوئی پھندا ہڈا کو نہ ہو۔ اُس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دنیا کی اصلاح کرنی تھی وہ دنیا جبر سے نیک سیرت، عالی مرتبہ اور وقار

رگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جمل سازی، اور شویت خوردی تو درکنار، اُس نے تو اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویا ہو، کیونکہ مجلیس اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی محنت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اُٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین گیر کٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اس کی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رشتہ دار اور بھروسہ دار چہرہ اور ذاتی تک کے ساتھ غلط مسلمان کا جوڑ مل جاتے۔ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اس کے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اُس کے لیے فرش راہ بنیں؟ جو شخص بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اس کے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اُدھے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ ہر حال مسلمان ہے خواہ عقیدہ و مسلک اور طرز زندگی کے اعتبار سے وہ اسلام کے ساتھ کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے مسلمانوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں کوئی صاحبِ غلامیہ خدا اور رسول کا مذاق اُڑا رہا ہے ہیں اور اسلام پر پھتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی "مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحبِ خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرست تمانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں، مگر ان کے "مسلمان" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحبِ سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ بھی "مسلمان"۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم مناجیہ یا شریعتی جی بناتے ہوئے سینما ایسے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبِ زادی سے دایولین بجا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی غلط "مسلمان" بدستور چکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام قرآن مجید سے مستثنیٰ ہیں، شراب

زنا، رشوت، بخور اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں۔ حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ان کو یہ معلوم کرنے کی پر راہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بار سے میں کیا کہتا ہے۔ خیالات، اقوال اور اعمال میں ان کے اور ایک کافر اور مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ مگر ان کا شمار بھی ”مسلمانوں“ ہی میں ہوتا ہے۔ غرض اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا ”مسلمان“ نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوئٹہ، گدھ، بیڑ، تیترا اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک ”چڑیا“ ہے کیونکہ چڑیا گھر میں ہے۔

پھر لطیف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ ”مسلمان“ جو کچھ بھی کرے وہ ”اسلامی“ ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام ”اسلامی بینک“ ہوگا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ ”اسلامی انشورنس کمپنی“ ہوگی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ ”مسلم یونیورسٹی“، ”اسلامیہ کالج“ یا ”اسلامیہ اسکول“ ہوگا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو ”اسلامی ریاست“ کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور عمروں ”اسلامی بادشاہ“ کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی ”اسلامی تہذیب و تمدن“ قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بت پرستی کو ”اسلامی آرٹ“ کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندگی کے اور اوقاہم لاطائل کو ”اسلامی فلسفہ“ کہا جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں گے تو ”مسلم سوشلسٹ“ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ ”اسلامی شراب خانے“، ”اسلامی قحبہ خانے“ اور ”اسلامی قمار خانے“ جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرز عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو ”اسلامی کفر“ یا ”اسلامی معصیت“ کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو خائفی الا اصطلاح (Contradiction in Terms)

لاشبہ مک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دکان پر آپ "بھری خوروں کی دکان گوشت"، یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موجودین کا بٹ خانہ" لکھیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب افراد کی ذہنیات کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اس تناقض سے متاثر نہ ہونا امر محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور سالوں میں مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھ لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی ناکہ سرکاری ملازمتوں میں، ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پُرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پُرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ **مَنْ كَفَرَ يَكْفُرْ بِمَا آتٰهُ اللّٰهُ** میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ **كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَخَلَّوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ** میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری پیچ پکار ہے۔ اسی کا نام اسلامی مقاصد ہے۔ اسی بخود پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس کی عین ضد ہیں۔ خود کر لے کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا نقطہ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیروں کو گل پُند سے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بیگ آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرائڈ کلسل میں اپنی فاشنگ کی مسئلہ پر اشتراکیت کی بقاء و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ

لے جو اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ کریں (المائدہ، آیت ۴۴)

لے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (النساء، آیت ۷۶)

پارٹی کا کوئی میر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جاسے تو کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے پارٹی میں رہنے دیا جائے گا؟ اور اگر کہیں وہ نازی اُرسی میں داخل ہو کر نازیٹ کو سر بلند کرنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شاید انتہائی اضطراب کی حالت میں دیتا، اور جس کو حلق سے اتار دینے کے لیے خنجر بنا دے گا، اُن کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت جھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سجدہ کیا جاسکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ سجدہ رُخ کھا لو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف یہ کہ حَرِیْثُ ثَمَرِ یَثْرَہ کے پودے سے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر گُفرا اور اسلام کے معرکے سر ہوئے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب دیکھیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو کسی کر دیا مذاق اڑا دے گا، کیونکہ اسلام کی ناکامی کرنے والوں ہی سے خود اس کے قتال کو اور اس کے دعوے کو اپنے معبود و شکم کے چرنوں میں پھینک پڑھا جاسکتا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپ کے ہاں ایک صاحب بڑے طےظنہ کے ساتھ ایک فوجی تحریک لے کر اُٹھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ تمہاری شوکتِ مفسد کو پھر تازہ کر دوں گا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوں گا پھر وہاں آپ کے بڑے بڑے نہیں، لاکھوں آدمی ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں اُن سے فلاح و کامرانی کی اُس نگاہ سے ہیں۔ آپ پر اس ادھر سے ادھر تک ان کی حمایت کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیرِ مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ اُن کے عقائد، اُن کے ہم قرآن، اُن کے اخلاق، اُن کی گفتار، اُن کے اعمال، اور اُن کے

۱۔ نہ قانون شکنی کا خواہشمند ہو اور نہ غیر ضرورت سے تحائف لے سکے۔ (البقرہ - آیت ۱۷۳)

۲۔ یعنی خوش گوار اور کھلے

طریق کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں۔ ایک شخص اسلامی اصطلاحات کے پردے میں میکا ویلی،
 ڈارون، آرنسٹ ہیکل اور لائل پیرسن جیسے لوگوں کے فلسفہ ریت پیش کرتا ہے،
 قانون قلبی اور قانون شرعی کو غلط ملط کر کے اسلام کی جڑیں یاد تک اکھاڑ پھینکتا ہے،
 ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت، توحید، ربانیت، جہاد، ہجرت، اقامت امر، جماعت
 سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے، اور تم نہ ہر گز کے یہ مسئلے گھونٹ مضمون اس طرح میں
 حلق سے نیچے اتار جاتے ہو کہ "یہ مسلم قوم" کی جس قدر پیغمبروں کو دے گا، ایک مضمون نکلا میر
 جھوٹ بڑھاتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے
 سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے۔ ^۱ ^۲ ^۳ ^۴ ^۵ ^۶ ^۷ ^۸ ^۹ ^{۱۰} ^{۱۱} ^{۱۲} ^{۱۳} ^{۱۴} ^{۱۵} ^{۱۶} ^{۱۷} ^{۱۸} ^{۱۹} ^{۲۰} ^{۲۱} ^{۲۲} ^{۲۳} ^{۲۴} ^{۲۵} ^{۲۶} ^{۲۷} ^{۲۸} ^{۲۹} ^{۳۰} ^{۳۱} ^{۳۲} ^{۳۳} ^{۳۴} ^{۳۵} ^{۳۶} ^{۳۷} ^{۳۸} ^{۳۹} ^{۴۰} ^{۴۱} ^{۴۲} ^{۴۳} ^{۴۴} ^{۴۵} ^{۴۶} ^{۴۷} ^{۴۸} ^{۴۹} ^{۵۰} ^{۵۱} ^{۵۲} ^{۵۳} ^{۵۴} ^{۵۵} ^{۵۶} ^{۵۷} ^{۵۸} ^{۵۹} ^{۶۰} ^{۶۱} ^{۶۲} ^{۶۳} ^{۶۴} ^{۶۵} ^{۶۶} ^{۶۷} ^{۶۸} ^{۶۹} ^{۷۰} ^{۷۱} ^{۷۲} ^{۷۳} ^{۷۴} ^{۷۵} ^{۷۶} ^{۷۷} ^{۷۸} ^{۷۹} ^{۸۰} ^{۸۱} ^{۸۲} ^{۸۳} ^{۸۴} ^{۸۵} ^{۸۶} ^{۸۷} ^{۸۸} ^{۸۹} ^{۹۰} ^{۹۱} ^{۹۲} ^{۹۳} ^{۹۴} ^{۹۵} ^{۹۶} ^{۹۷} ^{۹۸} ^{۹۹} ^{۱۰۰} ^{۱۰۱} ^{۱۰۲} ^{۱۰۳} ^{۱۰۴} ^{۱۰۵} ^{۱۰۶} ^{۱۰۷} ^{۱۰۸} ^{۱۰۹} ^{۱۱۰} ^{۱۱۱} ^{۱۱۲} ^{۱۱۳} ^{۱۱۴} ^{۱۱۵} ^{۱۱۶} ^{۱۱۷} ^{۱۱۸} ^{۱۱۹} ^{۱۲۰} ^{۱۲۱} ^{۱۲۲} ^{۱۲۳} ^{۱۲۴} ^{۱۲۵} ^{۱۲۶} ^{۱۲۷} ^{۱۲۸} ^{۱۲۹} ^{۱۳۰} ^{۱۳۱} ^{۱۳۲} ^{۱۳۳} ^{۱۳۴} ^{۱۳۵} ^{۱۳۶} ^{۱۳۷} ^{۱۳۸} ^{۱۳۹} ^{۱۴۰} ^{۱۴۱} ^{۱۴۲} ^{۱۴۳} ^{۱۴۴} ^{۱۴۵} ^{۱۴۶} ^{۱۴۷} ^{۱۴۸} ^{۱۴۹} ^{۱۵۰} ^{۱۵۱} ^{۱۵۲} ^{۱۵۳} ^{۱۵۴} ^{۱۵۵} ^{۱۵۶} ^{۱۵۷} ^{۱۵۸} ^{۱۵۹} ^{۱۶۰} ^{۱۶۱} ^{۱۶۲} ^{۱۶۳} ^{۱۶۴} ^{۱۶۵} ^{۱۶۶} ^{۱۶۷} ^{۱۶۸} ^{۱۶۹} ^{۱۷۰} ^{۱۷۱} ^{۱۷۲} ^{۱۷۳} ^{۱۷۴} ^{۱۷۵} ^{۱۷۶} ^{۱۷۷} ^{۱۷۸} ^{۱۷۹} ^{۱۸۰} ^{۱۸۱} ^{۱۸۲} ^{۱۸۳} ^{۱۸۴} ^{۱۸۵} ^{۱۸۶} ^{۱۸۷} ^{۱۸۸} ^{۱۸۹} ^{۱۹۰} ^{۱۹۱} ^{۱۹۲} ^{۱۹۳} ^{۱۹۴} ^{۱۹۵} ^{۱۹۶} ^{۱۹۷} ^{۱۹۸} ^{۱۹۹} ^{۲۰۰} ^{۲۰۱} ^{۲۰۲} ^{۲۰۳} ^{۲۰۴} ^{۲۰۵} ^{۲۰۶} ^{۲۰۷} ^{۲۰۸} ^{۲۰۹} ^{۲۱۰} ^{۲۱۱} ^{۲۱۲} ^{۲۱۳} ^{۲۱۴} ^{۲۱۵} ^{۲۱۶} ^{۲۱۷} ^{۲۱۸} ^{۲۱۹} ^{۲۲۰} ^{۲۲۱} ^{۲۲۲} ^{۲۲۳} ^{۲۲۴} ^{۲۲۵} ^{۲۲۶} ^{۲۲۷} ^{۲۲۸} ^{۲۲۹} ^{۲۳۰} ^{۲۳۱} ^{۲۳۲} ^{۲۳۳} ^{۲۳۴} ^{۲۳۵} ^{۲۳۶} ^{۲۳۷} ^{۲۳۸} ^{۲۳۹} ^{۲۴۰} ^{۲۴۱} ^{۲۴۲} ^{۲۴۳} ^{۲۴۴} ^{۲۴۵} ^{۲۴۶} ^{۲۴۷} ^{۲۴۸} ^{۲۴۹} ^{۲۵۰} ^{۲۵۱} ^{۲۵۲} ^{۲۵۳} ^{۲۵۴} ^{۲۵۵} ^{۲۵۶} ^{۲۵۷} ^{۲۵۸} ^{۲۵۹} ^{۲۶۰} ^{۲۶۱} ^{۲۶۲} ^{۲۶۳} ^{۲۶۴} ^{۲۶۵} ^{۲۶۶} ^{۲۶۷} ^{۲۶۸} ^{۲۶۹} ^{۲۷۰} ^{۲۷۱} ^{۲۷۲} ^{۲۷۳} ^{۲۷۴} ^{۲۷۵} ^{۲۷۶} ^{۲۷۷} ^{۲۷۸} ^{۲۷۹} ^{۲۸۰} ^{۲۸۱} ^{۲۸۲} ^{۲۸۳} ^{۲۸۴} ^{۲۸۵} ^{۲۸۶} ^{۲۸۷} ^{۲۸۸} ^{۲۸۹} ^{۲۹۰} ^{۲۹۱} ^{۲۹۲} ^{۲۹۳} ^{۲۹۴} ^{۲۹۵} ^{۲۹۶} ^{۲۹۷} ^{۲۹۸} ^{۲۹۹} ^{۳۰۰} ^{۳۰۱} ^{۳۰۲} ^{۳۰۳} ^{۳۰۴} ^{۳۰۵} ^{۳۰۶} ^{۳۰۷} ^{۳۰۸} ^{۳۰۹} ^{۳۱۰} ^{۳۱۱} ^{۳۱۲} ^{۳۱۳} ^{۳۱۴} ^{۳۱۵} ^{۳۱۶} ^{۳۱۷} ^{۳۱۸} ^{۳۱۹} ^{۳۲۰} ^{۳۲۱} ^{۳۲۲} ^{۳۲۳} ^{۳۲۴} ^{۳۲۵} ^{۳۲۶} ^{۳۲۷} ^{۳۲۸} ^{۳۲۹} ^{۳۳۰} ^{۳۳۱} ^{۳۳۲} ^{۳۳۳} ^{۳۳۴} ^{۳۳۵} ^{۳۳۶} ^{۳۳۷} ^{۳۳۸} ^{۳۳۹} ^{۳۴۰} ^{۳۴۱} ^{۳۴۲} ^{۳۴۳} ^{۳۴۴} ^{۳۴۵} ^{۳۴۶} ^{۳۴۷} ^{۳۴۸} ^{۳۴۹} ^{۳۵۰} ^{۳۵۱} ^{۳۵۲} ^{۳۵۳} ^{۳۵۴} ^{۳۵۵} ^{۳۵۶} ^{۳۵۷} ^{۳۵۸} ^{۳۵۹} ^{۳۶۰} ^{۳۶۱} ^{۳۶۲} ^{۳۶۳} ^{۳۶۴} ^{۳۶۵} ^{۳۶۶} ^{۳۶۷} ^{۳۶۸} ^{۳۶۹} ^{۳۷۰} ^{۳۷۱} ^{۳۷۲} ^{۳۷۳} ^{۳۷۴} ^{۳۷۵} ^{۳۷۶} ^{۳۷۷} ^{۳۷۸} ^{۳۷۹} ^{۳۸۰} ^{۳۸۱} ^{۳۸۲} ^{۳۸۳} ^{۳۸۴} ^{۳۸۵} ^{۳۸۶} ^{۳۸۷} ^{۳۸۸} ^{۳۸۹} ^{۳۹۰} ^{۳۹۱} ^{۳۹۲} ^{۳۹۳} ^{۳۹۴} ^{۳۹۵} ^{۳۹۶} ^{۳۹۷} ^{۳۹۸} ^{۳۹۹} ^{۴۰۰} ^{۴۰۱} ^{۴۰۲} ^{۴۰۳} ^{۴۰۴} ^{۴۰۵} ^{۴۰۶} ^{۴۰۷} ^{۴۰۸} ^{۴۰۹} ^{۴۱۰} ^{۴۱۱} ^{۴۱۲} ^{۴۱۳} ^{۴۱۴} ^{۴۱۵} ^{۴۱۶} ^{۴۱۷} ^{۴۱۸} ^{۴۱۹} ^{۴۲۰} ^{۴۲۱} ^{۴۲۲} ^{۴۲۳} ^{۴۲۴} ^{۴۲۵} ^{۴۲۶} ^{۴۲۷} ^{۴۲۸} ^{۴۲۹} ^{۴۳۰} ^{۴۳۱} ^{۴۳۲} ^{۴۳۳} ^{۴۳۴} ^{۴۳۵} ^{۴۳۶} ^{۴۳۷} ^{۴۳۸} ^{۴۳۹} ^{۴۴۰} ^{۴۴۱} ^{۴۴۲} ^{۴۴۳} ^{۴۴۴} ^{۴۴۵} ^{۴۴۶} ^{۴۴۷} ^{۴۴۸} ^{۴۴۹} ^{۴۵۰} ^{۴۵۱} ^{۴۵۲} ^{۴۵۳} ^{۴۵۴} ^{۴۵۵} ^{۴۵۶} ^{۴۵۷} ^{۴۵۸} ^{۴۵۹} ^{۴۶۰} ^{۴۶۱} ^{۴۶۲} ^{۴۶۳} ^{۴۶۴} ^{۴۶۵} ^{۴۶۶} ^{۴۶۷} ^{۴۶۸} ^{۴۶۹} ^{۴۷۰} ^{۴۷۱} ^{۴۷۲} ^{۴۷۳} ^{۴۷۴} ^{۴۷۵} ^{۴۷۶} ^{۴۷۷} ^{۴۷۸} ^{۴۷۹} ^{۴۸۰} ^{۴۸۱} ^{۴۸۲} ^{۴۸۳} ^{۴۸۴} ^{۴۸۵} ^{۴۸۶} ^{۴۸۷} ^{۴۸۸} ^{۴۸۹} ^{۴۹۰} ^{۴۹۱} ^{۴۹۲} ^{۴۹۳} ^{۴۹۴} ^{۴۹۵} ^{۴۹۶} ^{۴۹۷} ^{۴۹۸} ^{۴۹۹} ^{۵۰۰} ^{۵۰۱} ^{۵۰۲} ^{۵۰۳} ^{۵۰۴} ^{۵۰۵} ^{۵۰۶} ^{۵۰۷} ^{۵۰۸} ^{۵۰۹} ^{۵۱۰} ^{۵۱۱} ^{۵۱۲} ^{۵۱۳} ^{۵۱۴} ^{۵۱۵} ^{۵۱۶} ^{۵۱۷} ^{۵۱۸} ^{۵۱۹} ^{۵۲۰} ^{۵۲۱} ^{۵۲۲} ^{۵۲۳} ^{۵۲۴} ^{۵۲۵} ^{۵۲۶} ^{۵۲۷} ^{۵۲۸} ^{۵۲۹} ^{۵۳۰} ^{۵۳۱} ^{۵۳۲} ^{۵۳۳} ^{۵۳۴} ^{۵۳۵} ^{۵۳۶} ^{۵۳۷} ^{۵۳۸} ^{۵۳۹} ^{۵۴۰} ^{۵۴۱} ^{۵۴۲} ^{۵۴۳} ^{۵۴۴} ^{۵۴۵} ^{۵۴۶} ^{۵۴۷} ^{۵۴۸} ^{۵۴۹} ^{۵۵۰} ^{۵۵۱} ^{۵۵۲} ^{۵۵۳} ^{۵۵۴} ^{۵۵۵} ^{۵۵۶} ^{۵۵۷} ^{۵۵۸} ^{۵۵۹} ^{۵۶۰} ^{۵۶۱} ^{۵۶۲} ^{۵۶۳} ^{۵۶۴} ^{۵۶۵} ^{۵۶۶} ^{۵۶۷} ^{۵۶۸} ^{۵۶۹} ^{۵۷۰} ^{۵۷۱} ^{۵۷۲} ^{۵۷۳} ^{۵۷۴} ^{۵۷۵} ^{۵۷۶} ^{۵۷۷} ^{۵۷۸} ^{۵۷۹} ^{۵۸۰} ^{۵۸۱} ^{۵۸۲} ^{۵۸۳} ^{۵۸۴} ^{۵۸۵} ^{۵۸۶} ^{۵۸۷} ^{۵۸۸} ^{۵۸۹} ^{۵۹۰} ^{۵۹۱} ^{۵۹۲} ^{۵۹۳} ^{۵۹۴} ^{۵۹۵} ^{۵۹۶} ^{۵۹۷} ^{۵۹۸} ^{۵۹۹} ^{۶۰۰} ^{۶۰۱} ^{۶۰۲} ^{۶۰۳} ^{۶۰۴} ^{۶۰۵} ^{۶۰۶} ^{۶۰۷} ^{۶۰۸} ^{۶۰۹} ^{۶۱۰} ^{۶۱۱} ^{۶۱۲} ^{۶۱۳} ^{۶۱۴} ^{۶۱۵} ^{۶۱۶} ^{۶۱۷} ^{۶۱۸} ^{۶۱۹} ^{۶۲۰} ^{۶۲۱} ^{۶۲۲} ^{۶۲۳} ^{۶۲۴} ^{۶۲۵} ^{۶۲۶} ^{۶۲۷} ^{۶۲۸} ^{۶۲۹} ^{۶۳۰} ^{۶۳۱} ^{۶۳۲} ^{۶۳۳} ^{۶۳۴} ^{۶۳۵} ^{۶۳۶} ^{۶۳۷} ^{۶۳۸} ^{۶۳۹} ^{۶۴۰} ^{۶۴۱} ^{۶۴۲} ^{۶۴۳} ^{۶۴۴} ^{۶۴۵} ^{۶۴۶} ^{۶۴۷} ^{۶۴۸} ^{۶۴۹} ^{۶۵۰} ^{۶۵۱} ^{۶۵۲} ^{۶۵۳} ^{۶۵۴} ^{۶۵۵} ^{۶۵۶} ^{۶۵۷} ^{۶۵۸} ^{۶۵۹} ^{۶۶۰} ^{۶۶۱} ^{۶۶۲} ^{۶۶۳} ^{۶۶۴} ^{۶۶۵} ^{۶۶۶} ^{۶۶۷} ^{۶۶۸} ^{۶۶۹} ^{۶۷۰} ^{۶۷۱} ^{۶۷۲} ^{۶۷۳} ^{۶۷۴} ^{۶۷۵} ^{۶۷۶} ^{۶۷۷} ^{۶۷۸} ^{۶۷۹} ^{۶۸۰} ^{۶۸۱} ^{۶۸۲} ^{۶۸۳} ^{۶۸۴} ^{۶۸۵} ^{۶۸۶} ^{۶۸۷} ^{۶۸۸} ^{۶۸۹} ^{۶۹۰} ^{۶۹۱} ^{۶۹۲} ^{۶۹۳} ^{۶۹۴} ^{۶۹۵} ^{۶۹۶} ^{۶۹۷} ^{۶۹۸} ^{۶۹۹} ^{۷۰۰} ^{۷۰۱} ^{۷۰۲} ^{۷۰۳} ^{۷۰۴} ^{۷۰۵} ^{۷۰۶} ^{۷۰۷} ^{۷۰۸} ^{۷۰۹} ^{۷۱۰} ^{۷۱۱} ^{۷۱۲} ^{۷۱۳} ^{۷۱۴} ^{۷۱۵} ^{۷۱۶} ^{۷۱۷} ^{۷۱۸} ^{۷۱۹} ^{۷۲۰} ^{۷۲۱} ^{۷۲۲} ^{۷۲۳} ^{۷۲۴} ^{۷۲۵} ^{۷۲۶} ^{۷۲۷} ^{۷۲۸} ^{۷۲۹} ^{۷۳۰} ^{۷۳۱} ^{۷۳۲} ^{۷۳۳} ^{۷۳۴} ^{۷۳۵} ^{۷۳۶} ^{۷۳۷} ^{۷۳۸} ^{۷۳۹} ^{۷۴۰} ^{۷۴۱} ^{۷۴۲} ^{۷۴۳} ^{۷۴۴} ^{۷۴۵} ^{۷۴۶} ^{۷۴۷} ^{۷۴۸} ^{۷۴۹} ^{۷۵۰} ^{۷۵۱} ^{۷۵۲} ^{۷۵۳} ^{۷۵۴} ^{۷۵۵} ^{۷۵۶} ^{۷۵۷} ^{۷۵۸} ^{۷۵۹} ^{۷۶۰} ^{۷۶۱} ^{۷۶۲} ^{۷۶۳} ^{۷۶۴} ^{۷۶۵} ^{۷۶۶} ^{۷۶۷} ^{۷۶۸} ^{۷۶۹} ^{۷۷۰} ^{۷۷۱} ^{۷۷۲} ^{۷۷۳} ^{۷۷۴} ^{۷۷۵} ^{۷۷۶} ^{۷۷۷} ^{۷۷۸} ^{۷۷۹} ^{۷۸۰} ^{۷۸۱} ^{۷۸۲} ^{۷۸۳} ^{۷۸۴} ^{۷۸۵} ^{۷۸۶} ^{۷۸۷} ^{۷۸۸} ^{۷۸۹} ^{۷۹۰} ^{۷۹۱} ^{۷۹۲} ^{۷۹۳} ^{۷۹۴} ^{۷۹۵} ^{۷۹۶} ^{۷۹۷} ^{۷۹۸} ^{۷۹۹} ^{۸۰۰} ^{۸۰۱} ^{۸۰۲} ^{۸۰۳} ^{۸۰۴} ^{۸۰۵} ^{۸۰۶} ^{۸۰۷} ^{۸۰۸} ^{۸۰۹} ^{۸۱۰} ^{۸۱۱} ^{۸۱۲} ^{۸۱۳} ^{۸۱۴} ^{۸۱۵} ^{۸۱۶} ^{۸۱۷} ^{۸۱۸} ^{۸۱۹} ^{۸۲۰} ^{۸۲۱} ^{۸۲۲} ^{۸۲۳} ^{۸۲۴} ^{۸۲۵} ^{۸۲۶} ^{۸۲۷} ^{۸۲۸} ^{۸۲۹} ^{۸۳۰} ^{۸۳۱} ^{۸۳۲} ^{۸۳۳} ^{۸۳۴} ^{۸۳۵} ^{۸۳۶} ^{۸۳۷} ^{۸۳۸} ^{۸۳۹} ^{۸۴۰} ^{۸۴۱} ^{۸۴۲} ^{۸۴۳} ^{۸۴۴} ^{۸۴۵} ^{۸۴۶} ^{۸۴۷} ^{۸۴۸} ^{۸۴۹} ^{۸۵۰} ^{۸۵۱} ^{۸۵۲} ^{۸۵۳} ^{۸۵۴} ^{۸۵۵} ^{۸۵۶} ^{۸۵۷} ^{۸۵۸} ^{۸۵۹} ^{۸۶۰} ^{۸۶۱} ^{۸۶۲} ^{۸۶۳} ^{۸۶۴} ^{۸۶۵} ^{۸۶۶} ^{۸۶۷} ^{۸۶۸} ^{۸۶۹} ^{۸۷۰} ^{۸۷۱} ^{۸۷۲} ^{۸۷۳} ^{۸۷۴} ^{۸۷۵} ^{۸۷۶} ^{۸۷۷} ^{۸۷۸} ^{۸۷۹} ^{۸۸۰} ^{۸۸۱} ^{۸۸۲} ^{۸۸۳} ^{۸۸۴} ^{۸۸۵} ^{۸۸۶} ^{۸۸۷} ^{۸۸۸} ^{۸۸۹} ^{۸۹۰} ^{۸۹۱} ^{۸۹۲} ^{۸۹۳} ^{۸۹۴} ^{۸۹۵} ^{۸۹۶} ^{۸۹۷} ^{۸۹۸} ^{۸۹۹} ^{۹۰۰} ^{۹۰۱} ^{۹۰۲} ^{۹۰۳} ^{۹۰۴} ^{۹۰۵} ^{۹۰۶} ^{۹۰۷} ^{۹۰۸} ^{۹۰۹} ^{۹۱۰} ^{۹۱۱} ^{۹۱۲} ^{۹۱۳} ^{۹۱۴} ^{۹۱۵} ^{۹۱۶} ^{۹۱۷} ^{۹۱۸} ^{۹۱۹} ^{۹۲۰} ^{۹۲۱} ^{۹۲۲} ^{۹۲۳} ^{۹۲۴} ^{۹۲۵} ^{۹۲۶} ^{۹۲۷} ^{۹۲۸} ^{۹۲۹} ^{۹۳۰} ^{۹۳۱} ^{۹۳۲} ^{۹۳۳} ^{۹۳۴} ^{۹۳۵} ^{۹۳۶} ^{۹۳۷} ^{۹۳۸} ^{۹۳۹} ^{۹۴۰} ^{۹۴۱} ^{۹۴۲} ^{۹۴۳} ^{۹۴۴} ^{۹۴۵} ^{۹۴۶} ^{۹۴۷} ^{۹۴۸} ^{۹۴۹} ^{۹۵۰} ^{۹۵۱} ^{۹۵۲} ^{۹۵۳} ^{۹۵۴} ^{۹۵۵} ^{۹۵۶} ^{۹۵۷} ^{۹۵۸} ^{۹۵۹} ^{۹۶۰} ^{۹۶۱} ^{۹۶۲} ^{۹۶۳} ^{۹۶۴} ^{۹۶۵} ^{۹۶۶} ^{۹۶۷} ^{۹۶۸} ^{۹۶۹} ^{۹۷۰} ^{۹۷۱} ^{۹۷۲} ^{۹۷۳} ^{۹۷۴} ^{۹۷۵} ^{۹۷۶} ^{۹۷۷} ^{۹۷۸} ^{۹۷۹} ^{۹۸۰} ^{۹۸۱} ^{۹۸۲} ^{۹۸۳} ^{۹۸۴} ^{۹۸۵} ^{۹۸۶} ^{۹۸۷} ^{۹۸۸} ^{۹۸۹} ^{۹۹۰} ^{۹۹۱} ^{۹۹۲} ^{۹۹۳} ^{۹۹۴} ^{۹۹۵} ^{۹۹۶} ^{۹۹۷} ^{۹۹۸} ^{۹۹۹} ^{۱۰۰۰}

انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہئیں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے اٹھا اُسی کو پھاڑ کھلنے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریہ لہجہ اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اُس کی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ "مسلمان" کے مجد اگادہ وجود کے لیے کون سی دیر جو اُڑ رہی جاتی ہے؟

اور اگرچہ چلیے، آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ، جس کو نوکر و مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس رشت پر چل رہی ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس راستے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرز عمل اور ایک ایسی جماعت کے طرز عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اول نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی

۱۔ مراد ہے جنگ عظیم دوم جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ اور ۳ ستمبر کو برطانوی حکومت بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ (جہید)

۲۔ سلسلہ بیان ہی سے واضح ہے کہ یہاں زیر بحث مسلم لیگ کی وہ پالیسی ہے جو اس نے جنگ عظیم کے موقع پر اختیار کی تھی۔ اس مضمون کے آخر میں ہم آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولوشن مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو بطور ضمیمہ درج کر رہے ہیں۔ جس کو پڑھ کر شخص خود دیکھ لے کہ کیا یہ کسی ایسی جماعت کا ریزولوشن ہے جو جنگ کے متعلق خود اپنا کوئی اخلاقی نظریہ رکھتی ہو؟ (جہید)

کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے اُتینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام کے مسلمانوں پر پوری اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی ٹیگ بھی ایسی ہیج پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بدلے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ مسلمان اب اسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع تو عمل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اولاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا ہار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورتِ حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر مسلمان کے نام سے میرے ایک وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طریقہ عمل تو اگر میں نام مسلمان ہو تا تو کسی آسمانی کتاب کی ہوا بھی مجھے نہ ملے ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم ٹیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی، یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نشاندہ بھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطہ نظر سے جب میں مسلم ٹیگ کے

نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف دہرائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اس وقت منزل و اخطاط کے اُس آخری مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا ظہور باقی رہ جاتا ہے، اور اس تمام کا اطلاق برعکس نہند نام زدنگی کا فرق کے بعد اُن اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصلی معنی کی ضد ہوتی ہیں۔ نقطہ ریاست غیر اسلامی اور تمام اُن کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور ان کا نام ہی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ ذریعہ غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی سے لے کر اعلیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر بڑی سے بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک دو بات عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل نے ہمارے سوال کیلئے کہ اسلام جو کبھی اندھی اور اندھوں کی طرح اٹھا تھا، جن کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی، اُن کی کثرت کشائی اور عالمگیری، آخر میں چیز نے چین لی، اس کا جواب ہر ناب سمجھے ہی چکے، اسلام کی تحریک پر منزل و اخطاط کے اُس قانون کا عمل جاری ہوتا ہے جسے میں ابتداء میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سر نو ایک تحریک کی حیثیت دے، مثلاً چلیے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ گردن کی ایسی پستی میں جو حق پرست مسلمانوں والی ہی حرکت کر رہے ہیں، اور جن کی گہرائیوں سے ایسی تک پرشہادیت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی ظہور ملوث طریق اسلامی ہی میں ہے، اُن کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام ہی ہے۔ گماں کام کو نہ نکھیل نہیں ہے، یہ وہ کوہ کئی ہے جس کے تصور ہی سے فرما دلا نہ ہو، اب ہو جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن - نومبر ۱۹۳۹ء)

ضمیمہ

ذیل میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا وہ ذریعہ پیش درج کیا جا رہا ہے جو اس

نے ۸ ستمبر ۱۹۴۹ء کو پاس کیا تھا۔

”ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷ اگست ۱۹۴۹ء کو جو قرارداد نمبر ۱ منظور کی تھی وہ مسلمانان ہند کے صحیح جذبات اور آراء کی عکاسی کرتی ہے۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں کہ: ”برطانوی حکومت کی اس پالیسی پر اظہارِ افسوس کیا جائے کہ اس نے مسلمانان ہند کی مرضی کے خلاف ان پر ایک کانسی ٹیوشن مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۴۵ء کی زد سے تجویز کیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان پر ایک ایسی مستقل اور معاندانہ فرقہ وارانہ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی جو مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا سکے گی۔ نیز وائسرائے اور کانگریسی صوبوں کے گورنروں کا فرض تھا کہ اپنے اختیارات خاص استعمال کرتے آئلیشن کے حقوق کی حفاظت کرتے اور ان سے انصاف کرتے۔ لیکن انہوں نے اس ضمن میں مجددِ جہنمیت، بے اعتنائی اور بے تدبیری کا ثبوت دے کر کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ اندریں حالات اگر برطانوی حکومت آئندہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانانِ عالم اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی ہمدردی کے حصول کی غواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ بلانا اعلیٰ ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرے۔“

ورکنگ کمیٹی وائسرائے کے اس اعلان کو بہ نظر تحسین دیکھتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ فیڈریشن کی وہ سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں درج ہے معطل کر دی گئی ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہے۔ ورکنگ کمیٹی چاہتی ہے کہ معطل کرنے کے بجائے اس سکیم کو قطعی ترک کر دیا جائے اور ملک منظم کی حکومت تک اپنی آواز پہنچاتی ہے کہ بلا توقف اس مطالبے پر عمل کیا جائے۔ کمیٹی یہ امر بھی واضح کرنا چاہتی ہے کہ وائسرائے نے مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ”فیڈریشن مقصود“ ہے کی جو ترکیب استعمال کی ہے اور کہا ہے کہ ملک منظم کی حکومت کے پیشِ نظر ”فیڈریشن مقصود“ ہے، کمیٹی ہرگز اس کی تائید نہیں کرتی اور برطانوی حکومت

سے پُر زور درخواست کرتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے صوبائی حصے پر عمل درآمد کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں اور جو حالات بد سے ہیں ان کی روشنی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جلتے۔

”اس ضمن میں کمیٹی یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک خاص اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور عرصہ دراز سے مسلمان متوقع رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کی قومی زندگی، یہاں کی حکومت اور ملک کے نظم و نسق میں باعزت مقام حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تاکہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام رونما ہو اور وہ اپنے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی طرف سے مطمئن ہو کر اکثریت رکھنے والی قوم کے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ لیکن حالات میں جو غیر پیدا ہوا ہے، بالخصوص اس صوبائی آئین کے نفاذ کے بعد جو ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے طرز حکومت پر وضع کیا گیا ہے، حالات نے جس قسم کا پٹا دکھایا ہے اس کا گزشتہ دو سال سے کچھاد پر مدت میں یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اس صوبائی آئین نے بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت قائم کر دی ہے۔ اور مختلف کانگریسی صوبوں کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہر روز یہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان اس بات کے خلاف ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جائے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے بار بار ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہرگز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے ”فیڈریشن مقصود“ کے قطعی خلاف ہیں جس سے جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام حکومت کی اڑ میں ہندوستان پر اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اس ملک کے ایسے جس میں مختلف قومیں آباد ہوں اور جو ایک قومی مملکت نہیں بن سکتا اس قسم کا پارلیمنٹری نظام حکومت ہرگز موزوں نہیں۔

مسلم لیگ جس کی لاشی اس کی جینس کے نظریے کی مخالفت ہے۔ وہ ایسے حملے کی مذمت کرتی ہے جو بغیر کسی وجہ کے دوسرے پر کیا جاتے۔ وہ انسانیت کی آزادی کی علمبردار ہے اور طاقتور کو محض طاقت کے بل پر دوسروں کے حقوق خصب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی۔ ورکنگ کیٹی کو پولیٹکس انگلستان اور فرانس سے گہری ہمدردی ہے۔ بائیں ہمہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں برطانیہ کو اس وقت تک مسلمانوں کی مدد اور تعاون بخوبی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک معظّم کی حکومت اور وائسرائے کانگریسی صوبوں میں، جہاں آج مسلمانوں کا مال محفوظ ہے نہ جان، عزت محفوظ ہے نہ آبرو، اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق کو نہایت بے رحمی سے کھلا جا رہا ہے، ان کے ساتھ حق و انصاف کا سلوک نہیں کرتی۔ ورکنگ کیٹی نہایت پر زور الفاظ میں ملک معظّم کی حکومت اور وائسرائے سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جہاں جہاں صوبائی وزارتیں مسلمانوں کے حقوق کو تلف کر رہی ہیں، انہیں مظالم کا نشانہ بن رہی ہیں، اور ان کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، وہاں یہ گورنراپنے اختیارِ خاص کو خوار کرتے ہیں انہیں حاصل ہیں استعمال کریں۔ ورکنگ کیٹی نہایت انسوس سے یہ کہتی ہے کہ گورنروں نے اب تک مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے سے کوتاہی برتی ہے اور اپنے ان اختیارِ خاص کو محض اس خوف سے استعمال نہیں کیا کہ کانگریس کا ہائی کمان مسلسل یہ دہکیاں دے رہا ہے کہ اگر گورنروں نے یہ اختیارِ خاص استعمال کیے تو وہ ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی اکثریت ہے "ڈیلاک" پیدا کر دے گا۔

مسلم لیگ اگرچہ ہندوستان کی آزادی کی علمبردار ہے لیکن ورکنگ کیٹی ملک معظّم کی حکومت سے کہتی ہے کہ مسلم لیگ کی منظوری اور رضا مندی کے بغیر اس قسم کا کوئی اعلان نہ کیا جائے جس کا مقصد ہندوستان میں آئینی اور دستوری ترقی کے خارج معین کرنا ہو۔ نیز ملک معظّم کی حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ کسی قسم کا دستور وضع نہیں کر سکتی اور نہ منظور کر سکتی ہے جب تک اس بارے میں مسلم لیگ کی منظوری اور رضا مندی حاصل نہ کر لی جائے۔

فلسطین کے عربوں کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس نے

مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو سخت مجروح کیا ہے اور اس ضمن میں جس قدر احتجاج کیا گیا ہے اس کا کوئی معقول نتیجہ اب تک نہیں نکلا۔ ورکنگ کمیٹی پھر ایک بار ملک معظم کی حکومت پر زور ڈال کر کہتی ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات جلد تسلیم کیے جائیں۔

آج دنیا کو جو خطرناک بحران ہمیشہ سے اگر اس سے کامیابی کے ساتھ چھوڑا ہوئے کے لیے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا حقیقی اور ابرو مند اندہ تعاون درکار ہے تو اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ نیز اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا جو مسلمانان ہند کی ہر واحد نمائندہ جماعت ہے، اعتماد حاصل کرے۔

موجودہ نازک گھڑی میں ورکنگ کمیٹی ہر مسلمان سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے اس عزم صمیم کے ساتھ کھڑا ہو جائے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسی پر ہندوستان کے نوکر و مسلمانوں کی آئندہ تقدیر اور عزت و ابرو کا انحصار ہے۔

(ماخذ ادبہ ہمارے قومی جہد مجبوری ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۴۰ء تک) تالیف
ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور۔

ملے جن عبارتوں پر ہم نے خط پہنچ دیا ہے ان پر غور کیا جائے۔ ان میں حکومت برطانیہ کو اس شرط پر جنگ عظیم دوم میں تعاون کا یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمان قوم کے حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ تھے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں تھی کہ برطانیہ اور اس کے حریفوں کی باہمی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہے یا قتال فی سبیل الطاغوت۔ ہمیں صرف اس سے بحث تھی کہ ہمارے قومی حقوق کا تحفظ ہو اور اس تحفظ کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ہم اس قتال میں تعاون کے لیے تیار رہتے جو ہر حال قتال فی سبیل اللہ نہیں بلکہ فی سبیل الطاغوت ہی تھا۔ (جدید)

نسلی مسلمانوں کے لیے دُور ہیں

عمل۔ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہر حال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط

لازم ہیں:

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی یہ خواہش ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اُس کچھ اور کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ دوسری شرط قوت فیصلہ اور قوت ارادی ہے۔ آپ کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہش مند ہیں پھر اس فیصلہ کی رُو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک حیثیت سے محبت اور دوسری حیثیت کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اس حیثیت سے چمٹ جاتے اور کبھی اُس حیثیت کی طرف پکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس نَلَوَن اور تَرَدُّد

کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اُسے اُڑائے اُڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور اُن کی جماعتوں کے اعمال میں تلون اور خام کاری کی جو کیفیت ایک مدت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں اُن کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خود شناسی مفقود ہے اور کہیں قوتِ فیصلہ و قوتِ ارادی۔

ایک معتد بہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو میرے سے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں رکھتی۔ اُسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟

ایک دوسری جماعت، اور وہ بھی معتد بہ، ایسی ہے جو شعورِ ذات تو رکھتی ہے مگر قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس کے ہر پہلو کے مقتضیات کیا ہیں۔ لیکن اس علم نے اُن میں محبت اور خوف کے دو گونہ جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ انہیں اپنی حیثیت سے محبت ہے۔ لیکن جو کچھ یہ ہیں اُس ہونے کے مقتضیات کی دہشت اُن پر طاری ہو گئی ہے۔ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ آتا ہے۔ اس کے ساتھ پابندیاں ہیں، اُتار اور قربانی ہے، جہاد اور مشقت ہے، ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے، اور اس لڑائی کے مددِ ضمہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف ان کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں اور کوئی ایسی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انہیں خود بھی معلوم ہے

کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی قوت فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان مقررہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چٹنا چاہتے ہیں مگر اس کے مقتضیات کا خوفناک پہرہ دیکھ کر دُور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے کافر بن کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کر دو۔ یہ اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ لہذا اس سے بھی دُور بھاگتے ہیں۔ اب ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ڈھونڈتا ہو مگر کسی طرف کی بھی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اس لیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے، ان کے طریق کار میں غلطی ہے، ان کی قیادت میں غلطی ہے اور ان کی رُوحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ **يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا**۔ مگر بہت سے لوگ جن کو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نفس نے انہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسے کس راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تعاضیہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو ان کے مقتضیات اور ان کے نتائج کے ساتھ کھول کر

پیش کر دیا جائے ، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں ۔

میں نے ترجمان القرآن میں ”قوم“ اور ”جماعت“ کے اصولی فرق کی بحث اسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی ۔ اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ ”مسلمان“ کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے ، وہ دراصل ایک ”قوم“ نہیں ہے بلکہ ایک ”جماعت“ ہے ۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ”قوم“ ہونے اور ”جماعت“ ہونے کے معنیات و نتائج میں کیا فرق ہے ۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے ۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں ۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی الجھن اور نظر کے دھند کو دور کر دیں ، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں ، اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کے جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے ہلک ہیں ۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے ۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے متمازن ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے ، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہوتا جاتا ہے جسے ”قومیت“ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں ۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی ان کا لٹریچر کیا کرتا ہے ۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی قومی تہذیب کہا جاتا ہے ۔ ان میں طبغایہ

۱۔ ملاحظہ ہو ”تغبیات“ جلد اولیٰ، مضمون ”اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم“۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ”مسئد قومیت“۔
 یہ مضامین پہلے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں ان کو مذکورہ بالا کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔ (جدید)

خواہش ہوتی ہے کہ اس تہذیب یعنی اسلاف کے اس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاق کے لیے اسے چھوڑ جائیں تاکہ ان کی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبعی طور پر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مستط نہ ہونے پاستے۔ یہ ایک قوم کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اس کے پاس ہیں ان کی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انہیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو قوم کے معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اس کے لحاظ سے مسلمان صدیوں کے تواریث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اُن کے سیاسی اور معاشی مفاد اور اُن کی قومی تہذیب کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا ان کی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسل ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر قومیت پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ تہذیب جسے یہ اسلامی تہذیب کہتے ہیں محض موردی عادات و رسوم اور تاریخی تجارب کا مجموعہ ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انہوں نے باپ دادا سے پایا ہے اس کی حفاظت

۱۔ اسلامی تہذیب دراصل کس چیز کا نام ہے؟ اس کو میں نے اپنی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" میں بیان کیا ہے۔ (جدید)

کریں، جی وسائل معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انہیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انہیں اپنے گروہ کے افراد کی خوش حالی کے لیے ضرورت ہے اُن کو حاصل کر لیں، اور فی الجملہ اُن کی اجتماعی زندگی کا ضبط اُن کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی تہذیب ہے، اور یہی ان کے قومی مسائل ہیں، تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔ اس صورت میں:

ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے ابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ اُن کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور اُن کی تمام جدوجہد کا مقصد صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام پر یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اُس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ اُن کے لیے تمام تہاہیت صرف اسی چیز کی ہونی چاہیے کہ ملک کا نظم و نسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہر حال اُس کے ضبط میں خود اُن کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی وراثہ (یعنی اپنی قومی تہذیب) کو خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتد بہ حصہ اُن کے افراد کو بھی مل جائے۔

اُن کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کر لیں، بشرطیکہ اُس معاملہ میں اُن کے اپنے گروہ کا مفاد متصوّر ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اُس وقت پیدا ہوگا جب معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو

نظر انداز کر دیا جاتے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (Nationalism) پیدا ہوتی ہے اُسی طرح ان میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور ممکن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ ان کی تنظیم بھی فاشسٹی اصولوں پر کی جاتے۔ یہ بھی انتخابِ طبیعی (Natural Selection) اور بقیۃ الصالح (Survival of the Fittest) کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح "صلح" ثابت کریں اور غیر صالح بکرہ یوں کو مہم کرنا شروع کر دیں۔ یہ بھی استعماری قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جحش و تجزیہ مِن تَحْتِهَا اِلَّا ذَهْرًا طمعت پیدا کر لیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کر لینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلِ گروہ سے دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے، نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعہ اشخاص کی منفعت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے، نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے، نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تباہ و برباد (Struggle for Existence) کے میدان میں اُتریں اور انتخابِ طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی قومی تہذیب ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمائیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور قومی تہذیب سے تبری کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی

حیثیت پر اسی طرح دلالت کرنے لگے گا جس طرح اب لفظ ”مسلمان“ کر رہا ہے۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کون سی خصوصیت ہے جس کے لیے لفظ ”مسلمان“ ہی استعمال کرنا ضروری ہو؟

اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنیاد رکھ رہے ہیں، اولاً اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لیے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام یہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اس کو اسلام سے اور زیادہ دور پھینکے گی۔ آپ اپنے ”قومی مفاد“ کی حفاظت کیلئے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اور دنیا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو نہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کریں گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس وراثت کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اسی پارٹی سے لڑیں گے، نہ اس لیے کہ آپ کے اور اس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ آپ کے پیش نظر اصول نہیں ”قومی مفاد“ ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی مفاد کی تلاش میں ہر طرف لپکیں گے۔ فاشزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کریں گے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو اور یا استہائے ہند، جس کے آستانہ پر بھی فائدہ کا بہت بیٹھا نظر آتے گا اسی کی طرف سجدہ ریز ہوں گے، اور یہ سارے داغ آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو

احسانات کیے ہیں اُن کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام یہودیت اور ہندو ازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قومیت بناتا ہو بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک، اس نظریہ، اس تصور کو لے کر اٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جاتیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جاتیں۔ اُس کے نزدیک ”اسلامی“ صرف وہ چیز ہے جو اُس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو۔ اور جو چیز اُس کے خلاف ہو اُس کو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جئیں اور اُس کو دنیا میں حکمران بنانے کے لیے جدوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ بنیں گے، ورنہ اپنے لیے جینے اور اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلک اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

اڈالا وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر تافع نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی فطرت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ سگارات اور مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا کہ غالب ہونا چاہتا ہے،

لِيُظَاهِرَ عَلَى السَّيِّئِ كَلِمَةً وَلَوْ كَلِمَةً الْمَشْرُكُونَ ۝

ثانیادہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطہ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کئی اور جہانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اُس کو انسان سے بحث ہوتی ہے اور وہ اُن مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطعاً نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھٹتا ہے، کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۝ مثالاً اس کے پیش نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اُس کے اصول کے خلاف قائم ہے اُس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اُس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور اُن کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کی اپیل قطعاً غیر موثر ہو جائے گی۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موردی تہذیب اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالم انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق — نظریات نہیں بلکہ حقائق — دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، اُن سب کو لئے کر وہ اپنے تجویز کردہ نظام اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء (و نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔

۱۔ تاکہ وہ اس دین حق کو پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ (التوبہ: ۳۳)

۲۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے (آل عمران: ۱۱۰)

سادہ اس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس مراعات کا کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک انقلابی تحریک کی بنیاد بنادیا جائے، اُس پر ایمان رکھنے والے اُس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اُٹھیں، اور بالآخر اُس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقصدیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقصدیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظر ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکل بدل کر ان مقصدیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرف نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جمادینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پارٹی سے، جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شہر پر بھی سودا نہ کر سکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑے گا، اُن ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصول کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے اُن صالحین کو چن چن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی ہوگی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اُس میں کتنا ہی بڑا شخص یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑے گا۔ جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideological State) قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ بنیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہوگا۔ اُس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہو سکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں

اور سب سے زیادہ اُن کا اتباع کر سنبھالے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ مسلمانوں کی قومی تنظیم یعنی قیام اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگ صفت اول میں بھی جگہ پا سکتے ہیں، مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پچھلی صفوں میں ہوگا، بلکہ شاید اُن میں سے بہت سوں کو کسی صفت میں بھی جگہ نہ ملے گی۔

هَذَا تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ - آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔

اگر آپ معنی ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جادو چٹان کی سی ہوگی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اندر اُن کا مقابلہ اُسی طرح ہوگا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجڑا لے کر اپنا جہم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان کے اندر گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنی اپنی جگہ رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اُسی طرح کی وسعت جیسی فاسٹ اسٹ اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے اپیریلیٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک مفید قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائے گی۔

بخلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو

محض ایک عالمگیر مسلک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامی جسم (Organic Body) کی طرح ہوں گے۔ آپ کی مثال اس درخت کی سی ہوگی جو ہر طرف اپنے گرد و پیش سے اجزاء راہ جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت (World Force) ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے نفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر واقعی آپ کے اصول فطرتِ انسانی کو اپیل کرنے والے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں۔۔۔۔۔ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں۔۔۔۔۔ تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اُس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود کبھی نہ پھرنے لگی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچا پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے۔ دنیا اُن کی طرف خود کھینچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جیتیں اور مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور ہر قوم کے اشتراکیوں کو صرف اپنے قومی مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائے گی۔

اقلیت و اکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی تہذیب اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے لہذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی وجہ بن گئی ہے کہ مرثاوی کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چو گنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوچتی کہ وہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورت حال کی تہاد جبر یہی ہے کہ اس اشد کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے، اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک گندہ ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک ”قوم“ سمجھ رہا ہے، اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہو تاکہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفہ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی

پیش نہ آتی۔ اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ
 آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ "جماعتوں" کے
 لیے نہیں۔ جو جماعتیں کسی طاقت و نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں
 وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں۔ اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر
 حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲
 لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی، مگر اس نے، اگر ڈھائی لاکھ
 کو مستحضر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم
 پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالیوں پر چھا
 گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانہ کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی
 جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ
 مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن
 سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی
 جماعت کیا کرتی ہے، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے
 لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اُس جماعت
 کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اُس پروگرام
 کو لے کر اگر مسلمان جمعی مجاہدہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا
 نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ
 اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو
 اُس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی توتل تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ

سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں ان میں کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اس کے ارکان بھی ۳۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں اٹھ کر دس اور دنیا بھر میں چالیس کر دڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اُس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمر بستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر، قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی اُماد کی عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کو کشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیطانی مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات سر پھٹکول تک زور بت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش اُن کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ مردہری پیدا ہو گئی ہے

وہاں کچھ دوسری قسم کے مشیاطین نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیوی ترقی و خوش حسالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد و طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گنتی گزری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے وادگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انہوں نے اٹھ کر ڈر مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک نیچے گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جہاں نشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بے گانہ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اس غلط فہمی میں ڈال دیئے گئے ہیں کہ وہ نظریہ حیات جو اسلام ان کو دیتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان درجہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے جسطرے میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جاتے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اُٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرمانروائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی نسبت ان مسلمانوں میں سے اُس کو کچھ زیادہ والنیر نسبتہ زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اُسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر

ہونا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

اول یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیروں کے اس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں ان کو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملک خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے کیے جاتے ہیں، اور نہ اُس کی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرت تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام بنے کہ کوئی منظم جامعیت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اُس کی اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گی بلکہ شاید اُن سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گی اور کوئی طاقت اس سیل رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس ہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے

ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیروں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاہم کچھ واقعات اور خود بخود دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اس کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، اور پارٹی ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اس کے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کرڈوں کو اپیل کرتا ہے اور کرڈوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے، مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمران بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

(ترجمان القرآن - جون ۱۹۲۹ء)

شکایات

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی یہودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت کتنا بھی ہے یا نہیں؟ یہ سچ ہے کہ ردِ حاضر کے مسلمان بُرے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے، لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟..... کیا جس وقت تک سب راہِ راست پر نہ آجائیں اس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ ان کی بہتری کے واسطے انہی جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟..... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافتِ انسانیست ہے۔ مزدورت تو اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

”آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرز عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویے سے آپ کو خطر ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے اُن دو تحریکوں امدان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زبردہ رہنا ہے تو بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بڑی یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کریں گے۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے۔“

یہ دو خط منجملہ ان بہت سے شکایتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرز خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اد پر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش زند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اُتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقعہ میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیر دوستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ منج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہتا ہے، مگر اس کی حیثیت مارنیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پنک ہے جس کے نشہ میں مرین سو جاتا ہے مگر وہ اندرونی خرابیاں دُور نہیں ہوتیں جن کے سبب بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انہیں اسی پنک کی خورد اکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن کراہوں سے وہ چشمہ آبِ حیاں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب ظلم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد

پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں

پڑتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، مزید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گرو مسلمین میں شامل ہے، اپنی الفاظ سے اپنے عقائد کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح، دہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی الجھن کے سبب سے غلط فہمیاں دلچ ہو جاتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و دہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں۔ جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو۔ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہو گا جس کوئی نصیب فلاح مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔ ایسے، اور تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مُقَيَّد کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اس کے استعمال میں وسعت ہوتی ہے۔ اور جب اُسے مُقَيَّد کر دیا جاتا ہے تو اُس قید کا لحاظ کیے بغیر اُس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم "رنگ" بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہو گا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں، یا سُرخ میں، بہر حال ہم کہیں گے

کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سُرخ، بے زرد و دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس طرف بھی وہ بڑھے اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جاسکتا ہے۔ ہر شخص اُس کا میر قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے۔ غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلہ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عمومِ باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلہ پشاور" کا اطلاق صرف اُسی قافلہ پہ ہوگا جو عزمِ پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مگر اس یا بمبئی کی طرف اور کہلاتے قافلہ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائے گی۔ مثلاً قافلہ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلہ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ دوسرے راستہ پر وہ جتنے قدم بھی چلے گا، پشاور کی نسبت سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلہ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ انجمن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلہ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلہ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رُخ پر چاہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے "قافلہ پشاور" ہی۔

بجائے اس کے میں قافلہ پشاور کو اس کے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلے کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات بھل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزनों سے ان کی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زادِ راہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور بھل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، آپ اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بدلتی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا، پشاور کی قافلہ۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلہ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی تو نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورتِ قافیہ بن تو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست، مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافیہ بن جانے کا نام تو قافلہ پشاور بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کر ہر رہی ہے؟ اگر اس کا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلہ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں اس کی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اس کی منزل مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحبِ قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی مشرک بھی لے ہی لیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک عزم پشاور ملتی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ کا مزن نہیں، اس

وقت تک کے لیے نام تبدیل فرمائیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلہ پشاور ہی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی شرک تو بڑی دشوار گزار ہے، اس وقت ادھر جانا تو محال ہے، لہذا سرِ دست تو قافلہ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو دشوار گزار راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کیا تھا، میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلہ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلہ پشاور ہی رہنا مثلاً قرضِ باس ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرمادیں۔

اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مُقْتَد کو مُطْلَق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مُقْتَد کو مُقْتَد ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کر لیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مُطْلَق قافلہ، اور قافلہ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اس کی تنظیم اور اس کی پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ نفسِ اجتماع و تنظیم اور پیش قدمی سے کس کا فرسہ انکار کیا تھا؟ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ قافلہ پشاور نہیں تو اسے اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی شرک پر ہے تو قافلہ پشاور ہے۔ اور اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کر لے، بہر حال اس پر قافلہ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس شرک پر یہ جارہا ہے، وہ پشاور کی شرک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس شرک پر نہ ہو وہ قافلہ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوالی پھیر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمدردی اور بے مددی کا یہاں کوئی سوالی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازمِ پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلافِ واقعہ

باست باور کرنا آخر ہمدردی کی کون سی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے نادراقت ہوئے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لیں گے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں نہ تو ان کا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کروں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آرہی ہے اس کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو اُدپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریق فکر، ایک مقصد زندگی، ایک سیرت و کردار اور ایک طرزِ عمل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طرزِ فکر، وہ خاص مقصدِ حیات، وہ خاص اخلاق و اطوار اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لفظ "مسلمان" کے ان تقيّدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، اُن کی تنظیم، اُن کی قیادت و امارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم معین ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان تقيّدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے، جس چیز کو چاہے اُن کی فلاح و بہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے اُن کی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گتے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا دکھائی دے اُسے مسلمانوں کا قائد ملت اور امیرِ مطلق ماننے پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورت حال درپیش ہے۔ ”اسلام“ کی قید سے قطع نظر کر کے فی الواقع ”مسلمانوں“ کو محض ایک گروہِ اشتخاص سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، اُن کی فلاح و بہبود، اُن کی تنظیم و جمعیت، اُن کی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی رو سے مسلمان مامور ہیں اس پر کہ اُس پورے نظامِ مایات کو توڑ ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ الجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپ کی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اس کا نام ”مسلمانوں کا مفاد“ رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور شریعت سازہ جاس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو ”مسلمانوں کے مفاد“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقید کر کے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظامِ حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظامِ تعسیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اُس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اُس نظام کے تحت آپ خود اپنے خراج سے درس گاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پورا نظامِ تعسیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشے پر کرتا ہے جو اسلامی نقشے کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے، تو آپ

بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان سیاسی جمعیاتوں اور تنظیموں اور ان قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی دُور سے مسلمانوں کی جمیعت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الہی حکومت کو مٹا کر الہی حکومت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو حکمراں کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے، اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کھینچے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ و تلکُن ہو اُسے محض اس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے اختلافات فی الارض کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے پہلے اسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریق کار کو جانتے ہوں اور اہل تقویٰ و دیانت ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں، یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادی فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے بے جاہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چپیں بہ چپیں ہوتے ہیں اور شکایات کے طواریف اندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی براہِ نگینگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ بچو کہ یہ فیصلہ کتنا چاہیے کہ وہ اسلام

کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں سیدھی طرح ہر اس چیز کو ترک کرنا چاہیے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۳۹ء)

راہِ روشیت بمنزل

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں، اور اُن کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اُنہیں کیا ہونا چاہیئے، اور اس نقطہ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا اگر وہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر ان کے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

”کیا ہے“ پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالعرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائے گی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتیں ٹھیس ٹھس لگے گی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں الجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ اُجلہ کی فکر کریں۔ اُن کے نقطہ نظر کو دیکھا جاتے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس ٹھیس کھانے کے لیے موجود ہوں گی۔ ہر وقت اُن مصلحتوں کی

نراکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکیں گے کہ کون سا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی نظر کیا ہونا چاہیے، پر ہوتی ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اُسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو اہل حال کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انہیں اپنا کام پرستارین عاجلہ کی پیچوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ”جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے“ کی ذہنیت عام لوگوں پر مشتمل ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے کشیدائی اُسے دبانے کے لیے جیسوں قسَم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ اُن خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

”کیا ہونا چاہیے“ کے نقطہ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یکلخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوتا کرتا ہے۔ اول اول تو اُسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور شہسے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گزرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی تنقید میں کی گئی ہے، اور سننے والوں کا ضمیر بھی راست بازی کے ساتھ اُسی معیار کو حق تسلیم کرتا ہے جسے مد نظر رکھ کر ناقد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام

تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی پالیسی بدلتی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشوونما پا کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شکات پیدا نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جس کی بھیاں تک تصویر کھینچ کھینچ کر ”اہل حال“ حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو ستم تانگی ثابت کیا کرتے ہیں۔ کسی حالت کو مثال یا اینڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعۃً چھلانگ لگا کر اُس مثال حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے اچانک تغیر کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر بہر حال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثال حالت قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی اصرار نہ کرے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافتِ راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو، وہ فاروق اعظم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰ اور ابو عبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمان ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزل مقصود تو وہ مقام جس پر صحابہ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالفت سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہر حال میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے گا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند

کروں گا۔۔۔۔۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں ادھر جانے کے ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کونسلے کی کان میں اتنا شہد و رخ کر دیتا ہوں اور اس راستے سے اس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فائز العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فائز عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فادتی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں، اور جن کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی پھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطہ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں، جن کو زبردایت عربت مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اُس کے بعد اگر کوئی چیز اُن کی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض دینی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزلِ مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقل مند یہ مان لے گا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟
پشتِ بسنڈل چلنے والا تو خیر نادان بن کر چھوٹ سکتا ہے، مگر اُس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے جس کو وہ خود آئیڈیل کہتا

لے اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سُنے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”ہم اسے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے“ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علم قرآن کے بغیر بھی انسان اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حیثیتِ جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ (تدلیف)

ہو۔۔۔ گھبراتے، اُس کا نام سُن کر چپیں بہ جھپیں ہو جاتے، اُس کو پامال ہوتے دیکھ کر
 آفرین درجہ کے نعرے بلند کرے، اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے ڈرتے
 اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جلتے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی
 قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم اب تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ
 آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا
 ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا
 ہے۔ اگر کسی جمہوری سے اس کے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں
 اس غلطی پر اُسے ٹوک دیا جاتا ہے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اُٹھ نہیں سکتی۔ مگر
 اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوتا ہے، جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام
 ایسے توپیر سے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے
 نیرو ہاں چڑھ جاتی ہیں، اُس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال
 دیدہ دلیری و جبارت کے ساتھ تاویل کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے
 بڑھ کر نگاہ میں مبغوض کوئی نہیں ہوتا، ادا سے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر محبوب
 کوئی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے
 پرستار!

طرفہ تماشایہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی
 تہذیب کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی نعروں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت
 دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے
 ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانینِ خلائیہ توڑتے جاتے ہیں، اُسی تہذیب کو ذبح کیا جاتا
 ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی صدی جنگ صرف اس لیے ہے کہ
 دوسروں کے ہاتھوں اس تہذیب کا بھٹکانہ ہوسنے پائے بلکہ یہ خود اپنے ہاتھوں سے
 اس کو حلال کریں۔

وہاں ”مسلمان“ عورت اُسی مخرجِ جاہلیت کے ساتھ شمعِ انجمن بنی نظر آتی ہے

جس طرح کوئی شریعتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت چلے جاتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ سخاوتہ ملتی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لے کر پیروں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں ہشت و بر خاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی تہذیب کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور ایک معمولی مسلمان ان عامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو آٹنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سُنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہیں آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سنت کا نقطہ نظر صریح طور پر اُن کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور اُن کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کسی اس حیثیت سے نہ نہیں گئے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعہ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جاسیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ حیل و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانا ز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحبِ دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ کلچر جسے کانگریس اور اس کی تحریکِ وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے،

ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومت الہیہ تک پہنچا جائے گا جسے منہ ہاتھ نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ ————— یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اسلام اور اس کی تہذیب کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہو گا کہ یہ کیا مددائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کون سا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم تہذیب کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں اُس کا تحفظ کیا جاتا ہو گا؟

یہی دوزنگی اور گندم نائی و جو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوالی محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برائے گنجتہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں؟ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کر بیٹھتے جیسے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ رد و آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خود کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجا آئے خود رحمت ہیں، لہذا جو مرکز سامنے آئے اس کے گرد جمع ہو جائے اور سب مل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خطبہ پیدا ہوا تھا کہ ”آرٹ محض آرٹ کی خاطر“ اور ”ادب محض ادب کے لیے“ اُسی طرح اب یہ ایک نیا خطبہ پیدا ہو رہا ہے کہ ”اجتماع بس اجتماع کی خاطر“ اور ”تنظیم محض بغرض تنظیم“ اور ”مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے“۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی

نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخان کا مسلح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی مسنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورتِ تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس تنظیم میں جو لوگ سب سے اگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا مجمع مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پیچھے ڈبہ کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چرمحانی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس کی طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں جاسکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ نشیب کی طرف گڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ماشاء اللہ ہمارا ”انجن“ اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جاتے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کریں گے؟ جو اس سے غلامیہ بربریت و تباہی کس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کچھ کلمہ ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں گہری کاہدان کے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت ان کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی منصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک

قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر شیش خنجر کی ریح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطلع نظر ہے تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ وہی بات پھر کہوں گا جو اس سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد مسلم قوم پرستی؟

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ جماعت ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے جعلی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ”اللہ کی رستی“ کو مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس لوگوں کا متفق ہو کر کسی رستی کو تمام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رستی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ:-

إِنَّمَا دَلِيلُكُمْ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ۔

(المائدہ - آیت ۵۵)

”مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔“

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ:-

فَإِنْ قَامُوا فَاقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَانْصَرُوا لَكُمْ

فِي السَّيِّئِينَ - (التَّوْبَةُ - تَيْت ۱)

”پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تہا ہے

دینی بھائی ہیں۔“

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں میں بلی پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزام جماعت اور اطاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں اور مَنْ شَكَّ فِي الشَّكِّ اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور امامتوں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصولوں پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً توحید اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر ان ہدایات کو دنیوی جتنہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانینِ طبیعی کے مطابق اپنا جتنہ بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتنہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا دے اور دوسری کے جتنے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اُس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام ”سوادِ اعظم“ ہے اور

۱۔ جو جماعت سے الگ ہوا وہ الگ میں گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو، لہذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ درست دینوی کی سرسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی رُوح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں گھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو اُن کے ہلٹر کا نام ہرگز ”سوادِ اعظم“ نہیں ہے، نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے ”جماعت“ ہے، نہ اُن کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُوسے ”امارت“ ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ ”مسلمان“ سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم خالص اسلامی نقطہ نظر سے مفید ثابت ہوگی اُن کی گند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنُّج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اُس کی حالت کو دیکھ کر عقل مند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اُدپری عقل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظامِ جہانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنُّج کا علاج یا تھپاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے اور بخار کا علاج ہون میں دباؤ سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس اصلی خرابی کو سمجھیں جو کارگاہِ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے، اور ساری تدبیریں اُسی کو دُور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحبِ عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اُس کے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالمِ انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اُس پر تشنُّج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین ہل گئی ہے۔

لے واضح ہے کہ اُس وقت جگِ عظیمِ دوم پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ (دہرید)

اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں، اور دُوروں کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس میں بھی کسی وہ چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درو سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدت ہستے دراز سے یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بھگڑ اپنی اپنی نظریں مروت اُن خارجی علامات ہی پر جماتے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو چھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر اُننگی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اس کا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹر شپ ہے، اس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے، اسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اس کا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے؟ یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہاں اور ہے، اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک اُن کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اُس کی جڑ مروت ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی اُمّ الخبیثات ہے۔ یہی اصل پس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجرِ خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل پکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی ناکہ ایک انسان یا ایک خاندانِ خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا

ظلم اور کبتی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟
 امپیرلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ پس یہی کہ ایک قوم پر سے
 دوسری قوم کی خدائی اتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوشحالی
 کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی
 خدا بنی ہوتی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ صرف یہ کہ
 محنت پیشہ عوام مالدار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں
 کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل، اور امن کی
 نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں
 مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نفع العین جو پیش
 کر سکتے ہیں وہ پیش ادیں نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی
 بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا
 میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے
 تو کیا اس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اس جاہل اور نادان "خدا"
 کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل،
 راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ
 خواہشات۔

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی معائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی
 سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے

لے تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکی اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا
 ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔ (قدیم)

سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جاتے۔ اور یہ مصیبت کا ازالہ نہیں ہے بلکہ صرف اُس کا ازالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بِلَا اَب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستے سے آئے۔ اس کو اگر حل کہا جاسکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دق کو دود کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوتے، لیکن اگر اصل مقصد جان پہچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیامِ اجل سے تبدیل کر کے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جاتے، بہر حال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خُشْران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئولِ رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس اِدِّعا کی اور ایسے اِدِّعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہر حال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہے گا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہے گا۔ مگر جب بندہ اس عظیم الشان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اُٹھائے گا کہ وہ خود حاکمِ اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اس کا حاکمِ اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کرے گا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جس کے سامنے وہ برا بد ہو اور اپنے امر و نہی میں جس کی رضا لینے کا محتاج ہو، تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائے گی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت، اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اُس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے، اور جس کے حیضہ قدرت سے انسان کسی عالی میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اُس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اُس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک ملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے ملوکوں کا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت میں فرمانروائی کر سکے؟ اگر انسان اس سلطنت کے اصلی سلطان کی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اُس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا اذکار کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جس کی تردید زمین و آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقتِ نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہے گا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہے گا، البتہ خود اُس انسان کی زندگی از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائے گی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کر کے، یا خود اپنی حاکمیت کا تدعی بن کر کام کرے گا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا انداک کر دو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اس کے محتاج ہو کہ اس کی معرفت حاصل کر کے اپنی سسی و جمل کو اس کے مطابق بنادو۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اس کو جزوی ترہیات اور فردی

اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جھوٹ کے ہبٹ جانے اور اس کی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہو سکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اُس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اُس نظام حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدارِ اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اُس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اُسی کا ہو جو فی الحقیقت مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ ہر اُس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحبِ امر نہ ہوئے کائنات ہی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جوڑ پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافتِ الہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے لے گا، اُس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت ممکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اُسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اند اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پاسکتا ہے۔ ربُّ العالمین اور عالمِ النیب والاشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور

حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائقِ فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے مضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحبِ امر اور قانون ساز بننے کے زحمت سے دست بردار ہو جاتے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتے ہوئے اُس مضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو پڑھانا اور دوسری کو گھرانے کا مقصود ہو۔ بلکہ اُسے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کتبہ و مضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاد یہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہِ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع منظر سے تمام روئے زمین کو اُس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادثِ مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے طبع آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہِ راست حملہ کرتا ہے تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ اُسے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیانِ ناز، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا سے پوچھتا ہے:

ءَاذِنَاكَ مَتَفَرِّقُونَ خَيْرًا مِّمَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

(یوسف - آیت ۳۹)

”متفرق چوٹے چوٹے خداؤں کی بندگی ابھی ہے یا اُس ایک

اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟“

جو لوگ پہلی عورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام اُن سب کو ایک سمجھتا ہے،
خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ اُن کی ایک دوسرے
کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔
ان میں سے کسی کی دشمنی بھی نفسِ فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے
اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہوا اور اُس
کی جگہ وہ فساد سر بلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے
فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُس کا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس
کے لیے تو ایک جھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے جھوٹے رب کے بندوں
میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا ساما
نہ صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر حقیقی ربوں
اور الہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اُس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے
جو فی الحقیقت مَآبِ النَّاسِ، مَلِکِ النَّاسِ اورِ اللہِ النَّاسِ ہے۔

لفظ ”مسلمان“ اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض کلم کے طور پر انسانوں کے
کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل
ہونی چاہیئے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں
کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور
مسک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور
کوئی طریق کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ
اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں

ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہر حال سابقہ پیش ہی آئے گا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسبِ مہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان بہر حال ہے ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطہ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نامسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطہ نظر اور طریق کار اس مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان، کسی مسلمان اُسی ذلت ہو سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطہ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظام زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اس کا ذہن اسلام کے سانچے میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکمرانوں علی الناس للناس

کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ٹرکی اور دوسرے ملکوں پر اُن کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اُن کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ اس طرز عمل کی بنا پر مَغضُوب عَلَیْہِمْ سَوَیِّءُ تَعْرِیْفٍ میں آجاتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلم کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق حوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے، تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبد اللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ زانیہ شذوذ ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک ہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام رُٹے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب ملک کی

تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان کا سر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جاتے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ٹک ہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفعی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے — اور مجاہدینِ حریت میں سے کون صاحبِ یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے — کہ امپیریلزم کے الہ کو ہٹا کر ڈیو کر لیں گے الہ کو بُت خانہ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیمناٹ آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمُنُّ حَٰوَا السَّيِّءِ وَ بِالْحَسَنٰی عِ وَلَا يَكُنْ يَمُنُّ حَٰوَا السَّيِّءِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمُنُّ حَٰوَا النَّحِيْبَ۔

یہ حدیث نبوی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ بدی بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے ملتی ہے۔ ایک ناپاک کو شاکر و مرزا ناپاک اس کی جگہ لے لے تو ناپاک کی مٹی کہاں؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈروں یا قدیم طرز کے مذہبی رہنما، دونوں ہی اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوائی پوہائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گردہ کے دماغ پر ہندو کا ہوتا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گردہ کے سر پر انگریز کا بجوت مستط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، وہ نہ یہ دیکھتے کہ اصل شیطان نہیں ہے نہ وہ، اصل شیطان غیر اللہ کی حاکیت ہے۔ اُس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اُس کو مٹانے کے لیے زور جو تیر چلانا ہے اُس ہدف کی طرف شہست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اُسے محو کرنے پر صرف کر دو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کر دو گے وہ اسی طرح پرانندہ اور آنگاں ہو کر رہیں گی جس طرح ان لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُخْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَرْبًا۔ (الکہف - آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بے چاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں ملے ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے ان علمائے کرام پر جن کا راستہ دن کا مشعلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی اُنہیں اُس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصول طوط پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن

مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو ان کی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انہوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور ٹرپ ٹرپ کر تقریریں کیں، اُس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: **يَقَوْمِ اَغْبِثُ ذَا اللّٰهِ مَا لَكُمْ وِثْقًا** **الَّذِي غَثِّبَ بِكُمْ** **خَوَافًا** **بِاٰلِ كُسْرٰى** **مِنْ اَرْضِ سُدُومَ** **يَا مُكْرِمِيْنَ** **يَا هٰجِرَ كَاغْلَانِهٖ** **يَا نِيْلَ كِي وَادِي**۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے باہم حورج پر ہر جگہ ہر دور میں ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہنماؤں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعادل، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ **كُفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ** **اَبَدًا** **اَحَثٰى كُؤْمِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَرَحْمَةً** (المستحزنہ - آیت ۴) حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر **اَنْزِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ** کا مطالبہ کرتے سے پہلے **اِنِّیْ تَسْـَٔلُوْنِیْ مِنْ رَّحْمَتِ الْعَلِیْمِیْنَ** (الاحداث - ۱۰۴) کا اعلان کیا، اور **هَلْ لَّكَ اِلٰی اَنْ تَنْزِلَ** **وَاَهْدِیْكَ اِلٰی رَّبِّكَ** **فَتَخْشٰی** (النازعات - ۱۸-۱۹) کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا **وَبَنَّا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ** **شُجْرًا** **هَدٰی** (طہ - ۵۰) حضرت عیسیٰ نے، جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور اس پاس کی قوموں کو رومن اپیریلزم کے غلام جنگ آزادی کے جھنڈے

لے لے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَاقِبٌ ذُو بُكُوْرٍ
 فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ اَلْعَمَدَان - ۵۱ ظاہر ہے کہ یہ واقعات
 جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے
 ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا
 کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی،
 معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب
 یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانے میں تمام وقتی اور
 مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف
 کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا
 اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب بات تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ رہنما جو خدا کی طرف سے آئے تھے،
 سب کے سب عملی سیاست سے نا بلند تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے
 معاملات میں کون سی چیز مقدم اور کون سی موخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی
 کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی
 کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نام سے
 اور مسلمانوں کے نام سے رہنے ہوئے ہیں وہ مجتہدات شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں،
 بہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو
 چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق
 اُس تحریک سے ہے جس کے رہبر وہ رہنما انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص
 نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم
 کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں،
 اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے

یہ مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اُولَئِكَ السَّيِّئَاتِ هَدَى اللّٰهُ
 فِيْهِمْ نَحْمُوْا اَخْتِذَاكَ۔ (الانعام ۹۰) ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اُسی
 نظر سے دیکھنا چاہیئے جس سے انہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیارِ قدر وہی ہونا چاہیئے جو اُن
 کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیئے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔
 اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طریقہ عمل اختیار کریں گے تو
 گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبہ سے فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویہ سے معاملات
 دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھنا
 ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے بلند ترین غنیمتیں نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ
 ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے غصے رنگ بڑھانگ اختیار کریں گے، انہی کی زبان
 میں باتیں کریں گے، اور اُنہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ فریفتہ ہیں، تو اپنی
 وقعت کو ہم خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بُزغالوں
 کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے سنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی
 دست بردار ہو گیا۔ اب نہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وحشیانہ
 تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیئے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت
 اقلیت کے نعرے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور وِلیانِ ریاست
 کے ظلمِ عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادیِ وطن کے
 نعرے اور پنڈت نہرو کے مُردوں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری
 کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط حیثیت اختیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت
 اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی
 ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچی منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے

ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں، بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر بھروسے میں بند ہو تو بکری کی طرح جھپٹا لے گا، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھٹیڑیوں کی چہرہ دستی دیکھ کر اپنی شیرتیت بھول جائے۔

(ترجمان القرآن - مئی و جون ۱۹۴۰ء)

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہ لا شریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتنا بنا کسا پنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں مرث کر دیں، یہاں تک کہ انفرادی کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر مرث اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں۔

”آزادی پسند“ علماء اور اُن کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں، اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الہیہ کے نام سے قانون پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جاسکتی ہے۔ اور انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دہاتے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا اکثر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ امداس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منافع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دُور ہٹاتی ہے، مگر

سیاسی اغراض کے لیے اصول ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھودیں، پھر پھلا حکومت الہیہ کا خواب کہاں دیکھا جاسکے گا؟ لہذا امر درست اس کے سوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیار ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، افسر یہی وہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الہیہ کے راستے میں انہیں اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم، بلکہ ایک

نی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ کر اٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ اُسٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومتِ الہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اُس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوچہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوتے ہوئے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار، اردو سٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجہ ظلم و شکنجہ قہر میں اُن کو کستی تھی اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تشیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رو رہا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ پھر عالی رسول اور اصحاب رسول حکومتِ الہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بار بار وہ اس مقصد میں ناکام ہوتے ہیں۔ اُن کو ارد اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوتا ہے، نہ فراہم ہو گا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان

کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اُس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے رومیوں نے جو کچھ بتا دیا، اُس سے زیادہ ہولناک بتا دیا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پارہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جوابات پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصول تحریر ایک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی مصلحت و فلاح کے لیے وہ ایک دعوت لے کر اُٹھے اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجا تھے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم فطرت انسانی کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُن کے سمجھنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے درمیان غلط فہم کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ بعض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح تو میں سوچا کرتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرز فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سیدراہ پاتے ہیں جو بعض قومی مقاصد ہی کے لیے سیدراہ ہوا کرتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک ان دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا۔ اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو ناقص سے خالی اور اُلجھا دے سے پاک ہو۔

یہ ایک گھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابل تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جو منیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انہیں پیش کیا جاسکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لا محالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز و رائج سے خرید کر اپنا آلہ کار بنالیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی نعمت بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار

کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جاسنے یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی تعیناتی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلات جنگ ہی پر عبور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو رہی ہے اور جو طاقت ور ہو وہاں سے پس ڈالتی ہے۔ جو قومی کے مقابلہ میں پولیٹک ڈنمارک، ناروے، لیتھیا، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور ڈنمارک کو روس اور جرمنی سے کیوں دینا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف زمینیں تھیں۔ لہذا جس کی قومیت، تعداد، آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فرقی بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول سے کرنا اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست بننے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض لسل، تاریخ اور مذہبی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان و ناظر تا غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام یا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National State) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل القعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National Minority) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا پھر اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی

دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ ہمیں غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے ؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے ؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور ویسی ریاستوں کا ہمارے لئے کرہندو اپیسر ملزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اس فائدے سے کو دانٹوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہش مند ہو، ان تدابیر کے ہوا اظہار کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے ؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی ہے کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الہیہ قائم کر سکیں گے، حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی ٹھنڈا تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

در اصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھاجانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے نظری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیروں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے اُسے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے

ادنی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے اُنے گئے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں اُن پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی اتشباری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جرنل، ماہرین فنون، سرکاریہ، صنایع اور کارگر سب انہی میں سے اس کو بل جاتے ہیں، اور بے سرو سامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور تک کی طرح پگھل پگھل کر اس آبِ رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور با وسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اُٹھتی کہ قومی اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا رنگ چھوٹتا ہے تو کیفیت ہوتی ہے کہ:

ہم آہوانِ صحرا سر خود نہ سادہ برکعت

یا امید آنکہ روزے بہ شکارِ خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسولؐ کے اُتینے میں اپنی صورت دکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوعیت کی تحریک تو نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پا کر اپنی اصل حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے انہوں نے وہ سب حدودیں بھی اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں؟

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک حکم اڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی

مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ ہندی حکومت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیتہ العلماء اور آزاد انفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں صرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق تھرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فیصدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر اپنی قومی حکومت میں مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے حکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانون عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز و ایلان ریاست، ہندو سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم بھاری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر ٹھننے کے لیے یہ فردی ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو قبول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر و نبوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے ہرے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ہم نہاد مسلم قوم کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حید آباد، بھوپال، جہا دل پور اور رامپور جیسی ریاستوں کی حمایت میں اس لیے کریں کہ ان کے رقبے مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی حق ہی ہوگا جو اس کے بعد بھی یہ باور کر لے گا کہ ہم اسلام کے نظریہ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الہی قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس ادا میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصول

اسلام کی فرمائشوں کو قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسبِ آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرسے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہو گا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہو گا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحت عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستے پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہو گا۔ بلاشبہ ہمیں اس سے بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اُٹھانے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ میدانِ مسیح کے قول کے مطابق جُبحہ جاتا ہے تو گرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

(ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۴۰ء)

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جماتے ہوئے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب رگ جھجکتے ہیں، مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستہ میں حائل نظر آتا ہے اور اس کو دُور سے دیکھ کر یہ وائیں یا باتیں جانب مڑ جاتے ہیں تاکہ پھر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علی وجہ البعیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جا سکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جا سکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں، بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو عمل دعویٰ میں نے کیا ہے آپ میں اس کا تجزیہ کر کے ایک جزیہ پر الگ الگ بحث کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲۔ اس کی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟

۳۔ اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴۔ ان مشکلات کو دیکھ کر پھر کے راستے کون کون سے اختیار کیے جاسکتے ہیں؟

۵۔ ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶۔ مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح اُردہ ہر سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْنَا الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَبِهِ هُدًى
وَالْحَقُّ يَنْذِرُكَ عَلَى السَّيِّئَاتِ كُلِّهَا وَذُكْرٌ لِلْمُشْرِكِينَ

(التوبہ۔ آیت ۳۳)

”وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق

کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جہنمی دین پر غالب کر دے عوام یہ کام مشرکوں

کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“

اس آیت میں آنحضرت (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح

طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات،

ملکی انتظام، سیاسی حکمرانی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں

میں انسانی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہوتا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا

کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول نے کر لیا ہے وہ دین حق ہے۔ دین کے معنی

اطاعت کے ہیں، گیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ اس

کا اصل مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس دہرے سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال

عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ”دراصل دین“ کا غلط قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں ”اسٹیٹ“ کے معنی میں۔ لوگوں کا کسی بااقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، ”اسٹیٹ“ ہے۔ یہی ”دین“ کا مفہوم بھی ہے۔ اور ”دین حق“ یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے ”اسٹیٹ“ کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے بچنے میں بہت لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی نظر یہ نظریہ ریاست (Theory of State) پر نہ ہو اس کے لیے اس مضمون کا سمجھنا مشکل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ معنی اس انتظامی مشینری کا نام نہیں ہے جو اندرونی نظم و ملکت کا تحفظ اور بیرونی ملکوں کی ممانعت کرتی ہے، بلکہ کل کا اسٹیٹ درحقیقت پوری انسانی زندگی کا ٹھیک اُسی طرح احاطہ کرتا ہے جس طرح مذہب کرتا ہے۔ مشرقی اسٹیٹ ہو یا تاشنسی یا جمہوری، ہر ایک کی بنیاد میں ایک خاص ابعادِ طبیعی نظر ہے، ایک خاص تصور کائنات ہے، ایک خاص تصورِ انسان ہے، ایک خاص فلسفہ اخلاق اور ایک خاص اجتماعی فلسفہ ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص فلسفہ کے لحاظ سے ایک مقتدرِ اعلیٰ کا تعین کرتا ہے (مثلاً قوم یا باشندگان ملک یا کمیونٹی) جس کی نیابت و خلافت کسی ڈکٹیٹر، یا پارلیمنٹ یا پارٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ پھر اسٹیٹ کے حدود میں رہنے والے تمام افراد سے اس مقتدرِ اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اس کی غیر محدود اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ افراد کی زندگی اور بحیثیت جمہوری سولہ نشی کی زندگی کا کوئی شعبہ اسٹیٹ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسٹیٹ ہی اپنے نظریات کے مطابق ان کی تعلیم اور تعمیرِ سیرت کا ذمہ لیتا ہے، اسٹیٹ ہی اپنے فلسفہ اخلاق کے مطابق ان کے (باقی صفحہ ۲۲ پر)

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اُس نظام اطاعت (دین) اور اُس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳ سے) جیسے اخلاقی معیار مقرر کرتا ہے، اسٹیٹ ہی ان کی زندگی کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور حلال و حرام کے حدود مقرر کرتا ہے، اور اسٹیٹ ہی یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد کن امور میں صرف کریں اور کن میں نہ کریں۔ اگرچہ اسٹیٹ کی یہی حقیقت ہر زمانہ میں تھی اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ النَّاسُ عَلَى دِينٍ مُّكْتَرِبُونَ، مگر پہلے اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب یہ بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور تمام دنیا میں یہی نظریہ ریاست مسلم ہو چکا ہے۔

اب غور کیجیے کہ دین اس کے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ ایک مابعد الطبیعی عقیدہ، ایک مقتدر اعلیٰ کا تصور جس سے بالاتر کوئی اقتدار (Authority) نہ ہو، اُس مقتدر اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا، اور اپنے آپ کو اُس کی اطاعت میں دے دینا، ایک فلسفہ احاطہ و فلسفہ اجتماع (Social Philosophy) جس پر زندگی کا پورا انتظام قائم ہو، ایک ہمہ گیر قانون جو تمام معاملات زندگی کا احاطہ کرے، انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام تو دین ہے۔ اسی بنا پر خود راج کی کے مغربی فلاسفہ و مفکرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ فلسفہ کے اسٹیٹ نے خدا اور مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اس حیثیت سے ہے کہ جو شخص ان بیاستوں میں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کے برحق ہونے کا اعتقاد ہی رکھتا ہے وہ مومن بغیر اللہ مسلم بغیر اللہ ہے، مادہ جو ان کے برحق ہونے کا منکر اور اللہ کا مستحق ہے مگر ان کی اطاعت پر ملحق ہے وہ مومن باللہ و مسلم بغیر اللہ ہے۔ بنیاد اس کے انبیاء علیہم السلام جو دعوت لے کر آئے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ مومن باللہ اور مسلم باللہ ہو جائیں، اللہ ہی کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں، اسی کی اطاعت قبول کریں اور ان کی پوری زندگی پر وہی ہمہ گیر ضابطہ اخلاقی و قانونی محیط ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

اس چیز کو میں جن الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بلاشبہ وہ متقدمین کے ہاں کہیں نہ ملیں گے، کیونکہ اُس وقت یہ الفاظ ان معانی کے ساتھ مستعمل نہ ہوتے تھے۔ مگر انصاف کیساتھ دیکھیے کہ جس حقیقت کو میں بیان کر رہا ہوں، کیا وہی قرآن میں بیان نہیں ملتی ہے اور کیا اُس کو کام انکار کا بیان نہیں کرتے چلے آ رہے ہیں؟ افسوس یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

قانونِ حیات (انہدی) کو پروردی جنس دین پر غالب کر دے۔ پروردی جنس دین سے کیا مراد ہے؟ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنس دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آسنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزاء سمیت ایک بڑی

دقیقہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴ سے) سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام انبیاء نے یہی کہا ہے کہ اللہ ہی کو اللہ (دربارِ حشیت سے مقتدرِ اعلیٰ) تسلیم کرو، اسی کی بندگی اختیار کرو اور جو ضابطہ اخلاق و قانون (نظامِ شریعت) ہم اس کی طرف سے لے کر آئے ہیں اسی کی پیروی کرو۔ اور میں نے اسٹیٹ کی جو تعریف بیان کی ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھیے، (انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا عقیدہ، انسان کی طرف سے اس کی تسلیم و اطاعت، اور انسانی زندگی پر شریعتِ الہی کے نفاذ کا مطالبہ جو پیش کیا تھا وہ ایک الہی اسٹیٹ یا حکومتِ الہیہ کے قیام کی دعوت کے سوا اور کیا تھا؟ اگر مترجمین اس کے قائل نہیں ہیں تو وہ مجھے بتائیں کہ انبیاءِ آخریہ شریعتیں لے کر کیوں آئے تھے؟ یہ حرام و حلال کے حدود کس لیے تھے؟ یہ دیوانی و وجداری کے قوانین کیوں انہوں نے پیش کیے تھے؟ یہ من گھڑے **يَحْكُمُ بِنَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ** (المائدہ - ۴۵) اور **فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ** (البقرہ - ۲۵۶) اور **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ**

دیوسف - ۴۰) کا اعلان کیوں کیا جاتا تھا؟ اور سرنبی یہ کیوں کہتا تھا کہ **فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا** "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ کیا یہ شریعتیں اس حیثیت سے آئی تھیں کہ یہ بھی برحق ہوں اور انسانی ساخت کے قوانین بھی برحق ہوں اور انسان کے لیے یکساں جائز ہو کہ چاہے ان کی پیروی کہے اور چاہے اُن کی؟ (ترجمان القرآن - ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء)

اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہوجاتے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اس بڑی اطاعت اور اس منابطہ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ ہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھری چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد، اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانون طبعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوقاؤ کر رہا اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے پیچھے ہوتے قانون اخلاقی (شرعیات) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصے میں اپنے نفس یا دوسروں کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیۃ اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا احسناتی کمزوری کے سبب سے، ہر حال میں شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزامعت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲۔ اس نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو اُگھڑاؤ اور "دین حق" کی طرف دعوت دی جاتے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و

اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنالیں، ان کا ایک مضبوط جھنڈا بنائیں۔ پھر یہ جتنا تمام ان اخلاقی، علمی اور مادی فائدے سے جو اس کے اعلان میں ہوں، دین حق کو قائم کرنے کے لیے جہاد کبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظام اطاعت پر وہی "الہمدی" اور "دین حق" غالب آجائے۔

اس راہِ راست کا ہر مجتہد قابلِ خود ہے۔

پہلا مجتہد یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی عاقبت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے پیچھے ہوتے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے، ہر وقت جاری رہنی چاہیے، اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظام فاسد کی خود کمر نہاد حمایت کرنا، یا کسی نظام فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ "الہمدی" اور "دین حق" کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اُس کے منافی اور اس کے لیے محضت و ساقط ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوت حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اُسے ان تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا مجتہد یہ ہے کہ جتنا صرف اُن لوگوں کا بتایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اہلِ سمجھ و قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ ذاتی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانون زندگی بنالیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتنے کے لیڈر کیا معنی،

کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو جنی درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیسرونی معاون بن جلتے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اہل ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

تیسرا جزویہ ہے کہ براہ راست غیر الہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصد صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اللہ اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصد بنا کر اس کے پیچھے تو میں ضائع نہ کی جائیں۔

۱۔ بعض لوگ سرے سے اس بات ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنا نبی کے مقاصد بعثت میں سے ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دو یہ عجیب و غریب بات بھی کہتے ہیں کہ جب نبی کوئی پیغام لے کر آتا ہے اور اس کے مخالفین یا اولین لا کوئی گروہ اس پیغام کو قبول کرتا ہے تو ان کو اپنی حکومت قائم کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی حکومت اسلامی طریقے پر قائم کرتے ہیں۔ مگر اس حکومت کا پیغام ایک ضمنی بات ہے انہی کی بعثت کا اصل مقصد نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر نبی وہ کس قسم کا پیغام لاتا ہے جس کے قبول کرنے والوں کو اپنی حکومت ضرور قائم کرنی پڑتی ہے؟ اگر نبی کا پیغام صرف یہ ہے کہ اللہ کی پوجا کرو تو اس پیغام کے لیے اپنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ حکومت اسلامی طریقے پر قائم کرتے ہیں۔ اگر نبی کوئی نظام حکومت قائم کرنے نہ آیا تھا، نہ اس نے کوئی نظام پیش کیا، نہ وہ نظام حکومت اس کے پیغام کا کوئی جز تھا تو یہ ”اسلامی طریقہ کی حکومت“ کہاں سے آگئی؟ اور اگر ایک نظام حکومت بھی اس نے پیش کیا تھا اور وہ اس کے پیغام کا ایک جز تھا تو اس کا قیام مقصد بعثت سے خارج اور ایک ضمنی چیز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جو پیغام دیتا ہے اس کا کوئی حصہ اختیاری (Optional) بھی ہوتا ہے؟ یا اسے معنی ضمیمہ کے طور پر ساتھ لگا دیا جاتا ہے کہ جی چاہے تو اس کے لیے کوشش کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے؟ پھر اگر نبی کوئی نظام حکومت پیش کرتا ہے تو آیا اس کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بھی برحق ہے اور اس کی خلاف کوئی دوسرا نظام ہو تو وہ بھی برحق؟ یا اس کی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ یہی ایک برحق نظام حکومت ہے اور اس کے خلاف جو نظام ہے وہ باطل ہے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں (باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو ”اُتھدی“ اور ”دین حق“ کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں، نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتے ہیں جس کی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو ذاتی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوں، اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے ان تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اس کی تفصیل تو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی

دفعہ حاشیہ ۱۱ سے) تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں۔ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہِ کرم اچھی طرح خود کر کے بتائیے کہ حکومتِ اسلام اور حکومتِ کفر کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے اور ایک کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی وجہ یہ آپ کس طرح کریں گے؟ لاشِ ان باتوں پر خود کیا گیا ہوتا تو سمجھ میں خود یہ بات آجاتی کہ حکومتِ اسلامی کا بنیادی نظریہ اسلام کے عقیدہٴ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الہ الا اللہ کی نفی میں حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار اور لا الہ الا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیتِ اللہ کا اصرار شامل ہے اور یہ بنیاد ہے اسلامی حکومت کی۔

کرنے میں تین بڑی مشکلات نظر آتی ہیں جن کا کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو ان کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ”الہدیٰ“ اور ”دین حق“ کی طرف دعوت عام کا نتیجہ خیر اور کامیاب ہوتا موجودہ حالات میں ان کو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو ان کا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر ان تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانین شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی دعوت عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھلتی ہیں؟

(۲) دوسری مشکل جو انہیں اس راستہ میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ ان کے خلاف تعصبات موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سننے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُن کی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو ”قومیت“ کے اعتبار سے تو ”مسلمان“ ہے، مگر اس کا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چلی نہیں سکتے۔ اس کو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک حکومت الہی کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دشواری تغیرات میں ”مسلمانوں“ کے قومی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جن کو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں اُن کو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ صرف تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرالینا چاہیئے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سد باب کرنا چاہیئے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں ایک جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں۔ ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کریں گے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تخیروا اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر مجھے معلوم

ہے کہ اس طرز خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان کی تجویزیں اس وقت حالتِ جنینی سے گزر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے انحراف کس طرح کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصلی اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابتداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

”آزادی ہند“ کو مقدم رکھنے والے

پہلا گروہ زیادہ تر علماء و مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ ان حضرات نے مذکورہ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جاسکتی، اس لیے انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصد یہ ٹھہرایا کہ ”ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے“ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزاء جو میں نے بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جُز میں اُس سے مختلف ہے،

۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفع کرتے ہیں۔ اور یہ الہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اُس کی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

ان کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ حق کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کفر اور یکساں فتنان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوت عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں نہیں تسلیم کرتا؟ بعینہ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے رونا اس کی حیثیت کے منافی ہے۔ کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے دینی دعوئی جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف بن جائے تو انگریز کے دل کا دردانہ اس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس دینی اور قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

ان تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔

لے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اس کے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کرے گا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہوگی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لے گا۔ وہ ظالم کو ملامت کرے گا، نہ اس لیے کہ وہ ظالم قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ ظالم قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔ (تقدیم)

مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک سانس سے دو بالکل مختلف آوازیں سن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطہ نظر بدل گیا ہے۔ پھر مسلمان قوم کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک ادھ دھبہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور ان آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا لہر رہتا ہے۔ ایک متعدد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اٹھیں تو لا محالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو یکسوئی کے ساتھ اس خاص نظریہ کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک مخلوط اور غیر معین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھیں گے تو آپ کا معیار انتخاب، اکثر ان قیود سے آزاد ہو جائے گا جو متعدد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ کچھ مدت ہوئی مجھے ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم بطح کر ایسے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسہ عام کر لیا جائے جس میں عہد داروں کا انتخاب ہو جائے۔ یہیے، بس جمعیت کی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور چار آٹھ سالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ددڑوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقہ سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جُز میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظامِ اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور

اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سسی و جھڈ کا رخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیت عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے مراۃ مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے، اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں، پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا؟ ظاہر بات ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ نفوس انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ ہاشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیت انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کر دیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الہی نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونے اور غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُس کی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الہی نظام اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھادیں کہ اس کے زور سے دین انگریز کی مضبوط جہی ہوئی جڑیں اکھڑ جائیں اور دین ظہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عاتقہ خلاق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے

اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جبرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومت الہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جاسکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے؟ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو۔ دراصل یہ سنت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لاسکتا۔ جو شخص وہ حقیقت پروری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدے کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو، جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیے اور حکومت وہ ہونی چاہیے جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصد یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جوابدہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے؟ اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستے سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔ اور یہیں نے مشکلات کی جو تشریح کی

ہے ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی آزاد ہندوستان کے دور میں دور ہو جاتے گی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ گنرا کر نکل رہے ہیں وہ گل بھی اسی وجہ سے اصل مقصدِ اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چڑھیں گے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہیں گے، بہر حال آپ کو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ جو لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ اور جن کے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، ان کے لیے کسی پھیر کے راستے پر چلنا نصیحتِ وقت اور حماقت ہے۔ وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

پاکستانی خیال کے لوگ

دوسرا گروہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی ماخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موردِ وثی طو پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے اور ”مسلمان قوم“ ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں ”مسلمان قوم“ کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرزِ فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلطِ منط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلطِ ممیٹ کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس خلط کے ایک ایک جزء کی اصل ذرِ رعیت کی نشان دہی کر سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف

سے جس زمانے میں یہ مضمون لکھا گیا تھا اس وقت تک علماء کا کوئی قابلِ ذکر گروہ اس طبقے کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ایک اہمی خاصی تعداد اس میں شامل ہوئی، مگر اس کی پالیسی اور طرزِ عمل پر وہ کبھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ (جبرید)

یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گزردہ کی طرح اس گزردہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزا سے مختلف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجالس کی قراردادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہل قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے، بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفقہ متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے، اسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنالیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اوڈ آزادی پسند حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جن چیز نے ان کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ معز بنادیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلم کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے قابل نہیں رکھا ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی تفصیلات بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید برآں دعوتِ اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظامِ حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف ان "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے،

ایک طرف اسلامی نظام معاش کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارئین کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصول ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجالس میں اپنے حصہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیت رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصولوں پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اس کی حفاظت کے لیے پُر شور و ملام بندی اور دوسری طرف اُسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ منکر سے بودن و ہمزنگ مستانِ زیستین! ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی اُمید کی جاتی ہے؟

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو اردوئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی جماعت کی رکنیت کا بلا واسطہ ہیں اور جو اس کو قبول کر لے اُسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے دوڑوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرت رستے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش کرے۔ یہی ایک اصولی تحریک، تو اُس کو چلانے کے لیے یہ طریق جماعت سازی نہ صرف بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انہوہ عظیم جس کو

مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت راستے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزرگ خدا اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ توئی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی ”آزادی ہند“ کو

ملے اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولوشن اور لیگ کے ذمہ دار میٹروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطلع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بشکر ارجس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہ نظامِ حکومت تو وہ پاکستان میں بھی دیا ہی ہو گا جیسا ”ہندوستان“ میں ہو گا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اقرار کیا گیا کہ مسلمانوں کی لازماً حکومت اسلامی نقطہ نظر سے غیر مسلموں کی لازماً حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمہ دار میٹروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ البتہ جولوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔ واضح ہے کہ یہ اُس وقت تک کی پوزیشن تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

مقدم رکھنے والے حضرات کہہ رہے ہیں۔ اُن کی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صدور میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر میں موجود ہے، اور وہاں اُس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت الہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں، کیا آپ وہاں حکومت الہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلا وطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیئے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی ان آزاد حکومتوں کے سید راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی حتمی تحقیق آپ کریں گے جواب اس کے سوا کچھ نہ پاتیں گے کہ دراصل اصطلاحاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریہ حیات و مقصد زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ رذیل و اخلاق کے اعتبار سے مسلم نہ ہوں بلکہ بعض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومت الہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراض دنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے

دودھ کو پلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ مگر دودھ نہ ہر طے ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ نہ ہر طے ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے دودھ سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے مندرجہ قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الہی رکھنا اس پاک نام کو ذیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، ان کے نقطہ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کے نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا وہیہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت الہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے اُلٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدل ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت دے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام

کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں عامل ہوگی؟

تحریر دین کے مجوزین

اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکر اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ منفرد ہو جائے گا جو اسلام کے خلاف طبعیتوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب وہ بعض اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالات غامض ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جاسکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعیف دل اور ضعیف دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی مدد و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے مجاز ہی نہیں دیتے۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اُس کے صانع نہیں ہیں، اُس کے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خدا اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصلی صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جس کو لینا ہے اُسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اُسی صورت میں لینا ہو گا جس میں مالک نے اسے

دیا ہے۔ اور جو اُس کو اس ہستی مجموعی اور اس مقررہ صورت کے ساتھ نہ لینا چاہیے اُس کی خوشامد کرنے اور اُسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس کے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اس کو اور چاہو رد کرو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اُس کے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادت کی سجاوادی اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اس کے بنیادی فلسفے، اس کے نظامِ اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جاسکتا ہے؟ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماحذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے، تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہو اپری کی جائے گی؟ نیز وہ کون سا نظام تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا ایسے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں

وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظام تمدن و سیاست کے لیے رکار ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاس فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حسن دیکھ کر کہنے لگے کہ اُوڑ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

مہلی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جاتیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام تہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک روز وہی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اُس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کریں گے، بلکہ وہ مصمت پرست مسلمان بھی جنہوں نے اُن سے کم دہش پر سودا کیا تھا اُن کے ساتھ ان کی گمراہی میں شریک ہو جاتیں گے۔ مداخلت (Compromises) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں اُن میں ہمیشہ ہی خرابی ہوتی ہے۔

۴۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر اُن مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ نخرات کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جاسکتا؟

”تکڑا یہ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈالی لیں جہاں میں نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔ پہلی مشکل

پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی، اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور اخلاقی شریعہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اُس طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن

یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا بخیر و حل پیش کرتا ہو اور اس کے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعت (Metaphysical Problems) ایسے ہیں جن کے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک راستے قائم کرنا بہر حال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحہ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مال کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کیلئے ہے مگر انسان خود کس کیلئے ہے؟ یہ دراصل انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابلِ عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی نطفے، یا بالفاظ دیگر اس کے اعتقادات کو بھی متبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک کی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے، خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر وہ یہ کہتا اور سمجھتا ہے کہ میں بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کروں گا۔ یہ کمیونزم آپ کے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتداء کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم اس کا وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ

پہلویتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کیونکہ یہ پہلویتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں اور کوئی وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسانوں کو موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دیتا ہے، تو کیونکہ اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ کوئی زندگی ہے نہ حساب نہ کتاب۔ دیکھیے یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور تسلسل شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کیونٹسٹ نہ تھے، آج کیونکہ کے نقطہ نظر کو قبول کر سکتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطہ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کیونٹسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنا تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کون سی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم نہ کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party Discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کیونٹسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہیں، کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کیونکہ کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کیونٹسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہتھوڑا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو چانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے ان کو یہ ہتھوڑا اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد، یا آخرت کا اعتقاد یا پیغمبر کی ناقابلِ منازعت پیشوائی (Indisputable Leadership) اور قرآن کے آخری منبعِ قانون ہونے کا اعتقاد شرطِ لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس کی طرف کھینچ کر آنے میں سببِ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسئلوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسئلوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام ان کے سامنے تمام مسائلِ زندگی کا بہترین حل پیش کرے اور ان کی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پُرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تشریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اُسے بہر حال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تشریک پر ایمان لاتے ہیں وہ بہر حال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے موعظات (Dogmas) بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفہ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اجدادِ اسی طرح اُس کی عبادات محض پوجا اور پستی بنا کر رکھ دی گئی ہیں، حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف

کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لیے ان عقائد اور ان عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درس گاہیں اُٹار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدردانی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع اُن سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر مخصوص آئین، اور دُور سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُنٹی اپنوں کی تنفیر کا یا عیش بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے ظہر داروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر آدمی اسی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خیران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اسلام کے رستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا تصور نہیں ہمارا اپنا تصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک تحکُّمی عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہو گا۔ پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کا منطقی ربط واضح کرنا پڑے گا۔ پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل ان قوانین میں موجود ہے۔ تب

کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکیں گے، اور جب وہ اسے سمجھیں گے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ تعمیری کام چونکہ محنت محنت طلب ہے اس لیے اس محنت سے جی چڑا کر لوگ بنے بناتے آسان طریقوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہر حال ہیں اٹھانی ہی پڑے گی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیش نظر رکھا ہے اُسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دوسری مشکل

اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے اُن کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبقہ ہر شخص کے اندر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اس کے لیے نئی ہو، جس پر اُس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف اُن ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا، اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ صرف اسلام ہی کی راہ میں حائل نہیں ہے، ہر تختہ ریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کو دور نہ کیا جاسکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اختیار کیے اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکاتے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت اُٹھانا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گزشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں

نے، مسلمان زمینداروں اور رعیتوں نے اور مسلمان حوالم نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش ان کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مڑتا رہا۔ دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جس کی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اس کے اخلاق میں، اس کے معاملات میں کہاں کوئی خفیت سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نفرت برتا رہا ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا چہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہمسرے سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی اُن کے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے رُٹے مڑتا، جس کی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی نوعیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے رُٹے جھگڑتا ہے اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جن کے لیے وہ خود رُٹتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کون سی چیز اُس کو اس

مسک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی ناشدگی یہ لوگ کر رہے ہیں؟ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرتے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر فقل چڑھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر مصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیات اجتماعی کا مناسن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولوشن میں آپ ایک فقرہ تک ایسا نہیں پاسکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلی اصول لے کر اٹھے ہیں اور ان کی لڑائی محض اصول حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آتے ہیں، ایک ہی مرتبے کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصول نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا روناد دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جن کے لیے ان کے حریفوں کا دنا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبے پر ٹٹ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پُرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصول تحریک کی دعوت پر اُسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو

بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے مُنہ موڑیں، بلکہ ان کا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفسِ راوی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلافتِ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکاتے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے)، بلکہ اسلام کے اُن غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً لٹل کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال، اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور ان قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اُس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی مُرد ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ نہ کہیے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ اُتدہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثہ آبائی بتا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپ کا قومی مذہب بن کر رہے گا، کسی ایک عالمگیر وحوتِ مذہب بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بنحو فت اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آشکار ہوتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا اور کوئی چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھودی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اصول حق کے بجائے اپنی اغراض ذاتی و دنیوی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنالیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں ان کی آپ خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخص اور اجتماعی زندگی میں ان کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصد عالی کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اس کو پس پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپ کی اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کون سی ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۲ یا ۱۴ نکات پر تو ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ

لے یہ روم کے ان ۱۲ نکات کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے انہوں نے مارچ ۱۹۲۹ء میں پیش کیے تھے۔ ان نکات کی اصل عبارت مشرقی الاٹک کی کتاب : (Pakistan Movement Historic Documents) صفحہ ۷۰-۷۲ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان نکات کو بنور پڑھا جائے تو مٹا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اسی وقت تک مسلمانوں کو تحفظ دے سکتے تھے جب تک (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے یہ زیوریشٹنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لاتے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے تو لا الہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کون سی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعت حق کو اپنا مسلک اور خالص دین کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنالیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اس کے اصول حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس پر عمل کر نیوالی اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی اُن کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جانتے تو آخر کہاں جاتے؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے تجھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارض ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ تبینہ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلہ میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی مد مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لاتے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لاتے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے؟

تیسری مشکل

سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابل حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ سے) انگریزی حکومت ملک میں رہتی۔ ہندوستان کے ایک آزاد مملکت بن جانے کی صورت میں یہ تحفظات کسی کام نہ آ سکتے تھے۔ اس لیے دعوت اسلام تو دکندار خود مسلمانوں کے آئینی تحفظ کے لیے بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ (جدید)

نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہتا اور کارکن سب پر اگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان چند بڑی بڑی انجمنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورت حال نے پیدا کر دی ہیں :-

بعض لوگ غلط مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پاتی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصد ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو مسلم قوم پرستی کی حد تک پہنچنے لگتی ہے۔ جس طرح مونیخے اور ساڈزکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم و قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو، ان کی معاشی خوش حالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو)، اور ان کی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور ان کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ ان کا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کون سی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جہتِ میر میں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں اس کو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا، خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دُور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سرستید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مستط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو غلط غلط نہیں کرتے بلکہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے ہاندھتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم اُگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اور یہ چیز جو نہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے ادھر ادھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں، مگر یہ سوال ان کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کار فرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظام تمدن و سیاست اور اسی کے اُمتدہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔ اس سوال کی اہمیت اُن کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم سفر کو غٹوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اِس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام الجھنیں غیر اسلامی طرز فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی الجھن بھی ہمارے لیے الجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلک اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کا فند کی طرح اڑ جاتے جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلک اسلام کے پیرو ہیں اور اس کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصول اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے

سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دیں گے۔ قوی احوال کی ان تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہو گا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تیزی کریں گے۔ ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظام فکر و عمل سے، اس کی تبلیغ و اشاعت سے، اور اس کو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہش نفس اور غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجاتے وہ ہمارا بھائی اور رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدا نشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے اور غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اُنہیں تو وہ بھی اُنٹھے اور یہ نہ اُنٹھیں تو وہ بھی نہ اُنٹھے۔ اسلام ان کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اُن کے لیے جینے اور اُنسی کے لیے مرنے پر تیار ہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں ان کا بھی چاہے جا کر گر جاتیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائیں گے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہ یہی طرز عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہل کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت سب کو مانتے تھے، اور عبادات اور احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز ان میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس "نسلی مسلمان" قوم کے احیاء پر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان"، اصل مسلمان نہ بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامت دین کی کوششوں کو غوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے

”نسلی مسلمانوں“ اور غیر مسلموں سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اُسے اپنے حقیقی میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الہی نظام اطاعت یعنی دین حق کو قائم کرنے کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیکہ یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

(ترجمان المصطفیٰ - جنوری ۱۹۴۱ء)

اسلامی حکومت کی طرح قائم ہوتی ہے؟

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبیعتیہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچہ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose Thinking) کی تمام تردید یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام اسلامی حکومت ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقار

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت

کی ہو، مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اُس کو کسی جگہ جا دیا جاتے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطلق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیادی مرکب ہمیشہ کیمیادی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اُسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضائے کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکل اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیادی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملائے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، اُن کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما پانے کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اُسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر دراصل یہی یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اُسی کے مزاج اور اُسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اُسی کی طرف لے جانے والا طریقہ عمل اختیار کرنا بہر حال

ناگزیر ہے۔ اُس کے لیے مزدوری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اُسی قسم کے انفرادی کیرئیر تیار ہوں، اُسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اُسی طرز کی لیڈر شپ ہو، اور اُسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضائے اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد کرنے سے اُن کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھرتا ہے جس کے لیے اُن طاقت در اسباب نے جدوجہد کی ہو۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل اُسنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اُس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہو گا کہ جہاں تحریک، لیڈر شپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمت عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور اُمید یہ کی جاتی ہے کہ اُن کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہو گا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور حسام کاری کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اُس کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرّو ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ اصولی حکومت وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ نا آشنا رہی ہے اور آج تک نا آشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے

واقعہ تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقعہ ہوئے۔ محض ایک اصولی حکومت اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کر لے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حقدار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ سیاست نے اس تخیل کا بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلابِ فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ اُٹنے لگا تھا، مگر اس کی رگ دھپ بھی اب نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے اس لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے محمولہ مضمرات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، مگر جن کے اجتماعی تصورات تمام تربورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علومِ عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، اُن کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرونِ ہند کے وہ ممالک جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے اُناد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زبام حکومت آئی تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور

نے اس کی بنیاد و نفرت پر مبنی اس لیے شروع ہی سے خود اپنی قوم کے لوگوں پر وہ ظلم و ستم توڑے گئے اور اس قدر بے دردی سے قتل عام کیا گیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے قہقہے مات پڑ گئے۔ اس کے بعد اس کا رخ نیشنلزم کی طرف پھر گیا۔ (جدید)

اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی اندہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بے چارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ ”مسلمان“ کے نام سے جو ایک ”قوم“ بن گئی ہے اس کے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پروردہ ٹھاستے ہیں، اس کے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جو کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں سیشنلزم کا جو ش پھونکا جائے، ان کے اندر مرکزی اقتدار ہو، ان کے سیشنل گارڈس منظم ہوں، ان کی ایک قومی پلیٹیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority Rule) کے مسلم جمہوری اصول پر اُن کے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں ان کی تعداد کم ہو وہاں ان کے حقوق کا تحفظ ہو جائے، ان کی انفرادیت اسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں

۱۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن ایک قوم سمجھتے ہوئے اُن کو سیشنلزم کی بنیاد پر اٹھانے کے نتائج اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے تھے جب ۱۹۴۰ء میں یہ تقریر کی گئی تھی، لیکن ۱۹۴۱ء میں یہ بات سب کے سامنے آگئی کہ مشرقی پاکستان میں زبان کی بنیاد پر ایک نئے سیشنلزم نے مسلمان کو مسلمان سے پھاڑ دیا اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا وہ قتل عام ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں یہ بھی دنیا نے دیکھ لیا کہ سندھ میں علی الاعلان یہ تحریک اٹھی کہ سندھی زبان بولنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں، اور جو مسلمان سندھی نہیں بولتے وہ نہ صرف دوسری قوم ہیں، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ سندھ میں ان کو رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔ (جدید)

ہر قومی اقلیت (National Minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی و انتخابی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وخیو ذالک من القومیتات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملت، اقلیت، امیر، اطاعت، امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اسلامی فکر کے اعتبار سے یہ سب ان کے لیے مذہب، قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑاتے مل گئے اور غیر اسلامی رنگ کے لیے اسلامی رنگ کے خلاف کام دینے لگے۔

اصول حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اُس کی بنیاد رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ اندازہ تحریک، یہ عملی پروگرام نقطہ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ ٹکٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی ترویج یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم اُن کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اُسی پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی فلاح ہے اور جو اُس کو قبول کرے وہ اُس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اُٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ خود ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے طرانی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی قوم پرستی اور قومی ریاستیں ہیں، اُن کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور قومی اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح اُکی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں

کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافتِ الہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے؛ یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب یہ حیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے ہم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، اُن کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں، اُن سے ٹکیں وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریا کی لالچاں کریں، بلکہ یہ سارا بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اُس قانون کی پابندی

اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اُس کی ترکیب، اُس کا مزاج، اُس کی فطرت، کوئی چیز بھی اُن سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُس کی فوج، اُس کی پولیس، اُس کی عدالت، اُس کے مالیات، اُس کے قوانین، اُس کے محاصل، اُس کی انتظامی پالیسی، اُس کی خارجی سیاست، اُس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ ان کی عدالتوں کے چیف جسٹس اُس کی عدالت کے لٹریک بلکہ چیپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھہرتے۔ ان کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے فرائض خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا فائز ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا، اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعاً ناکارہ ہیں۔ اُس کو اپنے شہری، اپنے وٹرا، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور جسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائریکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پُرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اُس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا دینی و دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اُس

مناہجے اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنادیا گیا ہے، جن کی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے ترغیب اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ بن جائیں، جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصول اخلاقی کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔ اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ یہ ہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ، جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیشِ نظر خدا ہو، نہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہوں گے، اُن کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیباک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم

کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، اُن کے تعامل سے اُسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک اُٹم کے پھل دینے لگے۔ وہ حقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اُٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ میرٹ و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اُسی اخلاقی رُوح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مؤرخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ انکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکہ جادیں۔

اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس فسطح نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر سختیاں جھیل کر قربانیاں دے کر مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے غلوں اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل البیار (Finest Standard) سونا ہی

پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص اُتید یا لوحی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اُس کے مقابلہ میں دبے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اُس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اُس بدل ہوتی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طبع پر زمین تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظامدہک ہر درجہ کے مناسب کل پُرز سے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اُسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روس، ڈالٹن اور مونٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلابِ روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزار ہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو ہگل،

نشتے، گھومتے، نیتشے، اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اُسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی سادی نہ بنی، اخلاقی و نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت و جدوجہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian Morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر اعظم موسیو دو یقین رکھتے تھے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدریس کیائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم ان کے تمام دعووں کی دوا ہے۔ اسلامی حکومت "یا آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ بھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرنے کی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر، جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سر بلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ

کہ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اُس وقت وزیر اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور یہ معجزات کا قائل ہوں۔ (قدیم)

وہ مرنے یا سادہ کر ہو، یا ہٹلری یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ باپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیٹ پر۔ پس اگر ”مسلمان“ ایک نسل و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدترجہ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُن کا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیر کڑ کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کا فرقہ واریت میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر فرقہ واریت فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوہی، زنا، جھوٹ، اور دوسرے تمام دائم اخلاق میں یہ گنہگار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں گنہگار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اُٹا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر دیا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بیٹیوں کو جمع کر کے ایک منظم گٹھ بنادینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لوطی کی ہتھیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھڑیے کی درندگی پیدا کر دینا جنگل کی فریاد روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر یہ نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلیٰ کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون اُن کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں اُن کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے جذبہ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں لک کے ”انفاسِ قدسیہ“ سے

يَا خُلُوتَ فِي دِينِ اللَّهِ آخِوَا جَا كَا مَنْظَر دِكَاتِي دَسے كے گاہ كس جگہ ان كی دِھانی
 امانت كاسكہ جھے گاہ اور زمین پر بسنے والے کہاں اُن كا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں
 كی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے كلمۃ الحق جس چیز كا نام ہے اُس كے لیے تو صرف
 اُن كاركنوں كی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا كے قانون پر فائدہ د
 نقصان كی پروا كیے بغیر جتنے والے ہوں، خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ہوں یا
 كسی دوسری قوم سے بھرتی ہو كرائیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد كے لیے زیادہ قیمتی ہیں
 بہ نسبت اس كے كہ وہ انہوہ جس كا میں اوپر ذكر كرايا ہوں ۲۵ لاکھ یا پچاس لاکھ كی تعداد
 میں بھرتی ہو جاتے۔ اسلام كو تانبے كے اُن سكوں كا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر
 اثرتی كا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سكوہ كے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت كرتا ہے
 كہ ان نقوش كے نیچے خالص سونے كا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سكوہ جعلی اثرتیوں
 كے ڈھیر سے اس كے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔

پھر جس لیڈر شپ كی اعلائے كلمۃ اللہ كے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ
 ہے جو اُن اصولوں سے ایک اپنچ بھی ہٹنے كے لیے تیار نہ ہو جن كا بول بالا كرنے كے
 لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس ہٹ كی بدولت تمام مسلمان جوہ كے ہی كیوں نہ رہا ہوں
 بلکہ تہ تیغ ہی كیوں نہ كریئے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم كا فائدہ تلاش كرنے وال
 اور اصول سے بے نیاز ہو كہ ہر اُس تدبیر كو جس میں قوم كی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار
 كریئے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی كا رنگ مفقود ہو
 اُس مقصد كے لیے قطعاً ناكارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جمار كھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جس كی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے كہ "چلو تم
 ادھر كو ہوا ہو جدھر كی ہے اُس اسلام كی خدمت كے لیے كس طرح موزوں ہو سكتا ہے
 جس كا تطبیق ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے كہ ہو انخواہ كسی طرف كی ہو، تم بہر حال اُس راستہ
 پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین كر دیا ہے۔ میں آپ كو یقین دلاتا ہوں كہ آج اگر آپ
 كو ایک خطہ زمین حكومت كرنے كے لیے دے بھی دیا جاتے تو آپ اسلامی اصول پر

اس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مال گزاری، بینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کر سکتی ہے، مگر بڑا ذلیل ہے، اسلامی عدالت کے لیے چہرہ اسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا پورا نظام تعلیم جو حرکت زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اثنائاً کارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظمِ تعلیمات اور ایک سفیر بھی ہٹیا نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُن کے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو مقوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمران عبدالعزیز جیسا فرما رہا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ مومناؤں کی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کیلئے تیار نہ تھی۔ محمد تعلق اور عالمگیر جیسے طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظامِ حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ نامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظامِ حکومت میں نہیں بلکہ صرف

اس کی ادپری شکل میں خفیعت سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا یہ اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے ناہر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ دو طرفوں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی سیرت و کردار کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اُس بے لاگ عدل اور اُن بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چلے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ ملے گی۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا ناشی لیبیل لگا ہو گا، انقلاب کا راستہ روکنے میں اُس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اُس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہو گا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُس کے قیام کی کوشش میں اپنی وقت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے

کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی مضر اور ثابت ہوگی۔

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سر نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدا سے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری غلامت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رُسل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لا محالہ انہی لیڈروں کے طریقہ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طریقہ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دلچسپی کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہد جدید (New Testament) میں مسیح نامی علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آتے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ

۱۔ پاکستان کی کپیس تاریخ سے یہ بات کس حد تک ثابت ہوتی ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ (جدید)

۲۔ چونکہ مسیح کا طریق تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلے کو سمجھنے کے لیے مفید ہے، اس لیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اس مضمون کے ختم کے طور پر آخر میں درج کر دیتے گئے ہیں۔ (قدیم)

میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے بیج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا ہمیں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر نامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی فساد بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوک اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ کویت سے یمن تک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے، شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خوری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتنا خود حجاز اور یمن کے درمیان تخران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف

بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف
اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے،
یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں
کی طرف توجہ کی اور ان سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتداء میں ان سب کی طرف سے
نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطہ نظر
سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی
علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent) اور غیر ذمہ دار (Irresponsible)
سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا اللہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے
کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک
جوڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُپر سی اصلاح، انفرادی بلکاڑ یا اجتماعی
خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا
اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف
اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا
جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی مملکت
نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم
کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود و سلطنت
سے نکل کر کہیں جاسکتا ہے۔ اس اُپر اس اُپر اُپر کے مسائل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم
ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔
عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اُس کے حکم
کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہے۔ دوسری طرف اُس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی
دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک
ہی مختار کا رہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقعہ میں کسی کا

حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز یا تینس نہیں ہے، پانچس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہوئی نہیں ہے، ہولی نس سادی کی سادی اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے، لارڈ شپ بالکل اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law Giver) نہیں ہے، قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اُن داتا، کوئی ولی و کار ساز، کوئی دُعا پیش کنندہ والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی گنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جوڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھر کرانے پر تو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تہیہ و کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ عاکیانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلائے ہوئے اس مقام تک لے آئیں۔ یہ سب کچھ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا، اور چوتھے ہی اُس نے لا اِلهَ اِلا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظر نہ پھری۔ اس کی ذمہ داری پیغمبرانہ جرات اور جوش نہیں ہے۔ واصلِ اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے

پیدا کیا جاتے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے آئیں۔ لہذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبیر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تہیہ کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی ضمانت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذن کو اشدھن ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں میں لیتی ہے کہ وہ پکارتے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ گھسنے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیار (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے عوام میں سب کا باطنی اور سب کے مخرب ہوئی، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں پر داشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ پکایا کب زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو

اور دندے ہی دندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آتی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور گھٹنے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی مزب پڑتی تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پنجابیوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رقیوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اہلاد پرستوں کو اپنے باپ و دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اس لیے آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک کے رٹنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں مزید وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا دوزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا، سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر باناں پتھروں اور گالیوں سے تڑا دی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر بھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے بودی سیرت اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف اُسی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت

مقی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے بچانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بیٹی میں سے گزبکرتے۔

پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے نہیں، بلکہ محض حق و صداقت کے لیے، صرف خدا اور اس کی رضا کی خاطر مصائب و آلام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بٹو کے رے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفا کاریوں کا سختہ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جس کی مزدورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی میرت پیدا ہوتی۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلا وطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نثاران پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان گور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ بھی رہے، جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے وہ اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جاتیں، جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادۃ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جاتے، اور کسی حال میں بھی اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک ان کے دل میں نہ آنے پاتے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک سوچ سچیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، مرد، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی

ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پڑ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں، اگر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر حجب انہیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لا الہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو ملے کر ایسے لوگ اٹھتے ہیں جو معنی صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ ان کے دلوں پر جتنے پڑے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہوئے لگتے تھے اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بستی مٹی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اللہ صابنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھینچے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھینچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشمکش کی مزاحمت نہ کر سکا، مگر یہ یا سویرہ ہر صداقت پسند، بے لوث آدمی کو اس طرف کھینچا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصر اچھانچا یاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجازی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرتؐ کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پھیلا دھتہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں کٹا دیا۔ آخر کار نہایت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف شریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی

جہاز کا ملک التجار تھا، اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جہاز کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، عرب کی حسین ترین محبت آپ کے نکل میں دسے دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگادیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور تمسخر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، غنم، مغل (معاذ اللہ) کین لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں، مگر وہ شخص جو انسانوں کی ادنیٰ نیچ برابر کرنے لگتا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر انبیاء کو اس فکر سے کیسے دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچاؤں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے ہلال، اہم کے حبیب اور فارس کے سہمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوث تھی۔

مگر یہ ہے جب آپ کو جسرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں، رستہ حل کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دیتا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان

کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اُس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاقی تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ ڈنگ رہ گئے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد کے میدان میں آنحضرتؐ کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس غرشتہ مختلف انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت ان کے ہاتھ خدا کی بنا پر بڑھتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے سوچ رہے ہوں گے۔ عجیب نہیں کہ ہمد میں کفار کی شکست کا اخلاقی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی تربیت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اُس کو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبہ حکومت کو انہیں اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرادی۔ یہ وہ اسلامی آئینہ یا لوجی کے ایک عجیبہ تر نمونہ (Abnormal Form) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بیرونی لاوائی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اُس کی عملی صورت میں اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قابل ہو جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی

نکار اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی اس قاتل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ خالد بن ولید قاتل ہوئے۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قاتل ہوئے۔ ابوسفیان قاتل ہوئے۔ قاتل عکرمہ وحشی قاتل ہوئے۔ ہند جگر خوار ملک کو آخر اس شخص کی صداقت کے اُگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبنیٰ نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو آئنا تائیاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب عیسائی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصان کی تعداد ستر بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ انقلاب غیر فوجی انقلاب Bloodless Revolution کہے جانے لائق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کاپی اپسٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چودہ ادا چکے تھے ان کا احساں دیانت آئنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ کہیں کھانا چار طریقہ پر دوسروں کے ہاں کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں المینان دلا تا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور گھوڑے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمول سپاہی کو پاتھ تختہ ایران کی فتح کے موقع پر کر دلوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کھیل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تا کہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔

وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہونے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیل دار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے دھیر آئے نہ مانے لگا دیتے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس زالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بندھاں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوتے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود غلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر غاصب کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے صوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیرہ یہ کہہ کر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہذا جو کسی ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ سفیر پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرپور دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبعاتی اقتیادیت پر ایسی بر عمل تنقید کر کہ حد اچانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انتہائیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت

کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اُس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔
یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا
ہے۔ لوگ اس کو مجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی
آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ تھا۔ اس
میں علت و معلول کا پورا منطقی اور سائنٹیفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اُس ڈھنگ
پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور
اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت
قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے اُن جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے
کے بعد اسی پر پوری طرح نظر جمادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں۔ دنیا میں خواہ کچھ
ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک اپنا نہ ہٹیں۔ دنیوی زندگی میں اپنی
ذاتی حُرقت کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی اُتیدوں کا اور اپنے والدین کی تنادوں
کا خون کھاتے ہوئے نہ جھکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھٹ جانے کا غم نہ کریں، سوائی
حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے رٹ
جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے،
اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن - ستمبر ۱۹۴۰ء)

استدراک

اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ
ملاحظہ اُس اصل مقالہ میں شامل نہ تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ بعد میں اشاعت کے موقع
پر اس کا اضافہ کیا گیا۔ (جدید)

بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیئے جاتے ہیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر اپنی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت بدلتے چلتے ہیں جن میں مسیح علیہ السلام نے اہل فلسطین کو حکومت الہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں۔

”فقیہوں میں سے ایک نے — اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔“

فقیہ نے اُس سے کہا اے استاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔“

(مرقس - ۲۸: ۱۲ - ۳۲)

”تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور مرنے اسی کی عبادت کر۔“

(لوقا - ۴: ۸)

”پس تم اس طرح دُعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔“

(متی ۶: ۹ - ۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی،

اے ”خداوند“ اور ”الہ“ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ (قدیم)

مصلح بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے لیے باپ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ اسے ساری خلق کا باپ کہا جاتا تھا اور اس

کے معنی یہ نہیں تھے کہ خلق اس کی اولاد ہے۔ (جدید)

یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ اُن لامعات متعصبہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اُس کا حکم شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اُس کا قانون طبیعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

”یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار

چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اُدھی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو

اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور اُدھی کے دشمن اس

کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ

میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ

میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کوٹنے گا اور جو کوئی میرے

سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔“ (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

”جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی سے انکار کرے اور

اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔“ (متی ۱۶: ۲۴-۲۵)

”بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے

اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے

باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی

نجات پائے گا۔“ (متی ۲۴: ۱۰-۱۲)

”دیکھو میں تمہیں بھجوا رہا ہوں مگر باغیڑیوں کے بیچ میں۔“ اور میں نے

خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں

میں تمہارے کھڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے

۱۔ اپنی صلیب آپ اٹھانے سے مراد مزار سے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو میں عمارت ہے

سرمتھیلی پر لے کر نکلنا۔ (قدیم)

۲۔ اس سے مراد ہے خود پرستی اور اخراجی ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (قدیم)

ماننے حاضر کیے جاؤ گئے۔“ (۱۰: ۱۶-۱۸)

”اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بکریج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیوڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔“

(لوقا ۱۲: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں آئے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور سنی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اُسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

”شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی میرے داہنے گال پر ٹھانچہ مائے دوسرا بھی اس کی طرف پھیرے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوہہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگا رہیں لے جائے اس کے

ساتھ دو کوس چلا جائے۔“ (متی ۱۵: ۳۹-۴۱)

”جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو۔“

بلکہ اُس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے :

(متی ۲۸:۱۰)

”اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور رنگ خراب کرتا ہے

اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو :

(متی ۱۹:۲۰-۲۱)

”کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ تم خدا اور دولت دونوں

کی خدمت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھاتے گے۔ یا کیا پہنیں

گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔۔۔۔۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں

نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیروں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ، ان کو کھلاتا ہے۔

کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرے اپنی عمر میں ایک

گھڑی بھی بڑھانے کے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جھلکی سوس کے درختوں

کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں۔ پھر بھی میں

تم سے کہتا ہوں کہ شیطان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے

مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور

کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اسے کم اعتقاد و با تم کو

کیوں نہ پہناتے گا؟۔۔۔۔۔ تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی

کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔“ (متی ۲۴:۱۶-۲۵)

”مالگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو

تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔“ (متی ۷:۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیح نے ریہانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ

اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل، شہامت اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دینے

بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر

چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی طاقت

انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے ،
 سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جاتے ، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے
 نقصانات گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام اُنات
 مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہوا نہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے
 تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے ، گرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوہر بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا
 چاہیے ، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزانہ رزق فی الوقت جن کے
 ہاتھ میں ہیں ، ظاہر ہے کہ اُن سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ لہذا جو اسباب سے
 قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی اُن سے لڑ سکتا
 ہے۔

”اے محنت اٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے

پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا۔ کیونکہ میرا جوا طاقم ہے اور میرا بوجھ ہلکا“

(متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا
 جاسکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے
 دبے ہوئے لوگوں کو الہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس
 حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔
 ”غیر قوموں کے بادشاہ اُن پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جوان پر اختیار
 رکھتے ہیں وہ خداوندِ نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا
 ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند

ہے۔“ (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں (یعنی صحابیوں) کو فرماتے تھے۔ اس مضمون
 کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور فرودوں کو ہٹا
 کر تم خود فرعون و فرود نہ بن جانا۔

”نقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدے پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتاتیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری برجہ جن کا اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صد نشیمنی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے کہہ کر اپنا پسند کرتے ہیں۔“

”اسے ریاکار نقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔“

”اسے ریاکار نقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دودھ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دو گنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔“

”اسے اندھے راہ بتانے والو! تم مجھ کو تو چھانٹتے ہو اور اونٹ کو بھل جاتے ہو۔“

”اسے ریاکار نقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی فردس کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے

ہوتے ہو۔“ (متی ۲۳: ۲-۲۸)

یہ اُس وقت کے علماء اور محافل شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگی نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں روٹی قیصرہ سے بڑھ کر وہی عامل تھے۔

”اس وقت فریسیوں نے جاکر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔“

پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اُس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اسے استاذ ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرہیزگاری نہیں کرتا۔ ہمیں بتاؤ کیا سمجھتا ہے قیصر کو جسزیر دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اسے بیا کارو مانجے کیوں اذیت دے ہو؟ جزیر کا سرگم جھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر انہوں نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کا اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔“

(متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرادیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے گچھلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جو اس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے جو رد و معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس

لے مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک صخرہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو ہونا ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (قدیم)

کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانہ پیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے بڑے دور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ **أَشَقُّ أُمَّيَّةَ يَمَنَ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَسَاحِدَ بِلَاغِدَ بِلَاغِدَ رَشَدًا**۔ (الجن۔ آیت ۱۰) اہل زمین کو بعض ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا محسوس ہوتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پراگ ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اُد اُن کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ اُن کو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کے امداد شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ اچکی ہو۔ لہذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم و تدفین ادا کر دیں۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک

ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گزر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں مقناوم ہیں یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان کے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصوری کائنات، ایک ہی تصور انسان، ایک ہی نظریہ حیات اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ انسان کو حیران سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنیاد تجربہ و مصلحت اور خواہشات پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدت ہاتے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی۔ پھر جب اُس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا۔ مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لاتی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام النجات ٹھکانے کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شرور باری میں پہلے دونوں بر خورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ اُڑانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر اور اُس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس کے اندر جو روح البقر سے لے کر بدترین قسم کی دندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت ہلک ہے۔ وہ حقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام

شاخوں سمیت عمر طبعی کو پیچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور انچھڑا سا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور ازم کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت اب یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ فساد کے بعد اس کی شاخوں میں سے کوئی شاخ باقی رہ جائے، مگر یقیناً اس کا بقا عارضی ہوگا، جلدی ہی وہ شاخ خود چٹخ کر اپنے اندر سے آگ بھاٹے گی اور آپ اپنی ہی آگ سے جل کر خاکستر ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہوتی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے۔

ایک یہ کہ جاہلیت خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک باند اور طاقت ور تہذیب قائم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ ذریعہ انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جس کے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریے پر ایک نئی تہذیب کا قعر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جس کے اخلاق و اوصاف ان لوگوں سے مختلف ہوں جن کی خباثت و شرارت کا ابھی قریب ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اس کو لے کر ایسی ایک صلح جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقیناً ذریعہ انسانی ایک دوسرے دورِ ظلمت (Dark Age) سے بچ سکتی ہے، ورنہ کوئی قوت اس کو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ یہ صدمہ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدل جو کبھی دورِ وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوتی تھی، یہ بے رحمی و قساوت جس کی نظیر ورنہ جالوز بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں

کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات، جنہوں نے آج غارت گر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج اُلاتِ جنگ کی بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا نظریاتی نتیجہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی دل شکستہ اور مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جاتے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صلاحِ نظریہ اور ایک صلاحِ جماعت کا برسرِ کار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوتی تھیں، اب اُس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ بنیاد کٹ چکی ہے۔ جاہلی عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں اور انسانی فلاح و سعادت کا سرِ رشتہ دیوتاؤں یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ یہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے نوعِ انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسرِ انداز آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جاہلانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ بن سکتی ہے۔ گڑھا اور کٹا مسخ اور آہٹا اور ہمہ دوست کے نظریات، جو دوح کو سرد اور سمجھتوں کو پست اور قوائے فکر کو ایونِ منجیل کی پٹیگ میں مست کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان

کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصبِ جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سادہ سی اس تین مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان، تیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا مردہ اور مردہ زوال تو ہیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔

ہم ہی جاہلیتِ خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانورِ فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازعِ لبقاء اور انتخابِ طبعی اور بقائے اُصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصلح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا، جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام ٹہنیوں کے ساتھ سامنے آچکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ ترقی اور نسلِ تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی میعاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، تعمیریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے نکتے ہیں، افراد سے لے کر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بن کر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسبِ حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلتے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے اور ان کا جو بھی چاہے بناسے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوتے ہیں، کسی انسانی خللی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس شجرِ خبیث کی عین فطرت کا تقاضا ہی ہے کہ اس

سے یہ پھیل پیدا ہوں۔ لہذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پاسکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسدک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے،

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے ”تصور حیوانی“ اور مسیحیت کے ”پیدائشی گنہگار“ اور ہندو مت کے ”جہیز ناسخ“ سے بلند تر ہو،

جو انسان کو مختار مطلق اور شریعہ ہمارے بنائے بلکہ اسے سلطان کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے اگے ذمہ دار و جوابدہ ٹھیرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق رد و بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو،

جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدنی ارقعت میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے مواد دنیا میں اور کونسا ہے؟ لہذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے

کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات کا کام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نظریہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ ممکن ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے ذریعہ انسانی کالین بن جانے کا امکان ہے، اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک دغلا اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دغلا نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مغرب ہوتے چلے جاتیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل حق اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے، مذہبات دراز ملک و لوں اور دماغوں پر علوم و ادب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جاتے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی نہ وال بدل رہنے کے باوجود ماہر سال تک زمین پر قبضہ جاتے رہتے ہیں۔ وہ خود جب تک چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ مہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، نسبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و ادب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدون کرے، حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھ جلائے کہ لوگ اُسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں۔ ایک طرف اُن پرانے سانچوں کو ڈھائے جن میں انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن میں نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں۔ اُنہی طرف پرانے نظام تمدن و

سیاست کو بزورِ مٹاتے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کرے۔

پس دنیا کو اُنکھ دُرِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہو گا اور وہ صرف اسی طرح دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اُس کے خودِ مطیع بنیں جس کا جملہ پر ایمان لائے ہیں اس کے خودِ پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح سمجھتے ہیں اُس کا خودِ نمونہ بنیں، جس چیز کو حرام سمجھتے ہیں اُس سے خودِ چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو اُن کی صداقتِ ناپ ہی مُشتبہ ہو گی کجا کہ کوئی ان کے اُسے سر تسلیم خم کرے۔ پھر اُن کو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہو گی، اُس سے اور اس کے پیروں سے تعلق توڑنا ہو گا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، اُمائشوں اور اُمیدوں کو چھوڑنا ہو گا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ اُن تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہو گا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلا وطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیِ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے، اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوتا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو، محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی

طاقت جس قدر ضروری ہے، اُسی قدر اُن انسانوں کی سیرت، اُن کے عمل اور اُن کی قربانی و مہم فرشتی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت، سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے مہر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ اہل ہائی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ علومِ ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دین حق ہو یا دین باطل، مگر دین حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دین باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک ہیں صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی جھٹی میں سے گزر کر جب تک ساری کھوٹ حل نہ جائے اور پورے عیار (Standard) کا گند نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اُس کو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ٹلے کیے ہوتے زیور بیچنا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَىٰ
حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ - (آل عمران - آیت ۱۷۹)
”اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے
جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب غلط ملط ہیں) وہ نہ مانگے
جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔“

أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتَذَكَّرُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ
لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ - (عنکبوت - ۲-۳)
”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے،

چھوڑ دیتے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھیٹی میں تپایا نہ جائے گا؛ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں دینی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے، ان سب کو ہم نے تپایا ہے، پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔
 اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ
 الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَآءُ
 وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتَى
 نَصُرُ اللّٰهَ - (بقرہ: ۲۱۴)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت لوگ زری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلما مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟“

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَتْرَكُوْا وَلَمَّا يَفْعَلِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَت
 جَاهِدُوْا مِنْكُمْ وَلَهُ يَنْجِيْ ذٰلِكَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلٍ
 وَلَا اٰمُوْمِيْنَ وَلِيُجَازِيَ - (توبہ: ۱۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یوں ہی چھوڑ دیتے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔“

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَا اُوْدِيَ فِي اللّٰهِ
 جَعَلَ فِتْنَةً لِلنَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ، وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ
 لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُوْرِ
 الْعٰلَمِيْنَ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ السَّٰفِقِيْنَ
 (العنکبوت: ۱۰-۱۱)

”اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب

اللہ کی راہ میں نہیں تھکایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے
 ڈرنا چاہتے۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جاتے تو یہی لوگ
 اگر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے غیب
 واقف نہیں ہے؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں
 اور منافق کون؟

وَلَقَبَلُوا مِنكُم مِّنْ شَيْءٍ ۚ وَمِنَ الْخَوَافِ ۚ أَلَجُوعَ ۚ وَنَقْصٍ مِّنَ
 الْأَمْوَالِ ۚ وَالْأَنفُسِ ۚ وَالثَّمَرَاتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ
 إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
 أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۚ وَأُولَٰئِكَ
 هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (بقراءۃ - ۱۵۵ - ۱۵۷)

”ہم ضرور تم کو خطر است اور ناقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات
 آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دید و ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت
 کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف سے ہیں پلٹ کر جاتا ہے۔ ایسے
 لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے ہر باریاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ
 راہِ راست پانے والے ہیں۔“

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ
 وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَاقْتَصَرْنَا مِنْهُ خَوْفًا وَلَٰكِن لَّيَبْلُوًا بِعَظْمِكُم
 بِجَعْنٍ۔ (محتسب - ۴)

”اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ
 لوگوں کے ذریعہ سے آزماتا ہے۔“

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔
 نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اثنا عشری میں ان کو تباہ کر کے رکھ
 دے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے

ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہلک پیش نہ آئیں، سچے اہل ایمان جو ٹٹے مدھیوں سے ٹٹیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک کارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتنا نہیں بن سکتا جو خلافت الہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریہ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریہ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دُمن سکے پکے اور اپنی ہر عزیمت و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو ہیں ایک مبارک دُور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اُس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ بعض ایک دہم ہے اور اسی دہم اُنہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور ہرمنی پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری اُن کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ دوس کا انقلاب جو ابھی چوبیس پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اُس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزار ہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے، مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے، سائبریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلا وطنی کی حالت میں برسوں تک

ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیسا،
 خانہاں پر بادی کو خور اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سب کچھ اُس وقت کیا جب کہ زار کی سلطنت
 کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جاسکتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے۔
 یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت و خون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک
 کو آزاد کرا سکیں گے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا
 مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کون سی ممکنات تصور مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت
 نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اُٹھائیں، مجلسِ دوام میں عمریں گزار دیں، پھانسی
 کے تختہ پر جانیں تک دے دیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط، مگر
 اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان و مال اور
 شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں
 ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اسی ہندوستان کے باشندوں
 میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاشیاں کھائیں، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت
 کیے؟ کیا ہار دہلی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھروں کے برتنوں تک
 کی قربانی اور نیلامی کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آج ابشارِ رو
 قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں؟ اگر ہٹلر اور مارکس
 اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر
 خاکِ وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا
 خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت
 اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کا عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں
 کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے، البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اذہب
 اَنْتَ وَجَلَّتْ فَقَامِلًا اِنَّا هُمْنَا قَاعِدٌ وَف۔ جادو تم اور تمہارا رب دونوں ٹریں اور ہم یہاں بیٹھے

(ترجمان القرآن - اپریل ۱۹۴۱ء)

پس ۱۱ (المائدہ - ۶۴)

لے دیا ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے ۴۴ سال بعد ۲۲ اگست ۱۹۸۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ (جدید)

الف

مطالبہ پاکستان کو

یہود کے مطالبہ "قومی وطن" سے تشبیہ دینا غلط ہے

سوال: "ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا نظری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ سارے عالم کو قانون اللہ کے اگے مفتوح کر دے۔ لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگ بھائی پاکستان چاہتے ہیں، ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ؛ تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطہ نظر سے یہ قابلِ اعتراض نہیں؟ یہودی قوم مقہور و معذوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن ان کے قبضہ میں ایک اپنا زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔ میرے خیال میں مسلمان، یا بالفاظ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی چند مقدس سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور معذوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و معذوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صفت میں لا کر کھڑا نہ کر دے گی؟

جواب: پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش "حصہ سوم" میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے، اُن کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں، اُسے اُن کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اُسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی اُن کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک اُن کا قومی وطن نہیں ہے اور اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اُسے بزور ہمارا قومی وطن بنادیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ گئے رہنے سے اُن کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو بر نقصان پہنچتا ہے اُس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور ملحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اُس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بعینہ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے "مسلمان" ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انہیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مستط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ البتہ ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی

اور عزم بڑا جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک "قوم" ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصل حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطے میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظام اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اُس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۳ء)

مسلم لیگ کے اختلاف کی نوعیت

مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے حسب ذیل سوال نامہ ہمارے پاس بھیجا گیا ہے :-

۱۔ کن اصولی خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی اصلاح اُن حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں۔
اصول، روایات اور نقطہ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براؤ کریم حسب ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے۔

(الف) ایک ایسا قابل عمل دستہ تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی اچیل کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارس فکر کو متحد اور مربوط کیا جاسکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجیے جو اصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انہیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر وہ حسب، وہ ایسی آزاد ریاستیں حاصل کر لیں جن میں ان کی اکثریت ہو تو ایک ایسا نظام حکومت قائم کر سکیں جس میں مذہب اور ریاست کے درمیان ایک خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(س) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دسمرئے رائج آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔

اس سوالنامے کا جو جواب ہماری طرف سے بھیجا گیا وہ درج ذیل ہے :

آپ نے جو تفصیل سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزاء ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو ایک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزاء ہیں؟ وہ وہ بڑا سوال یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنہیں بنا قرآن کا اصل منشا تھا؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو، جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ کہ انسان سے اس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انہوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے عملائین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو، اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مدارات و معاہدات (Compromise)

اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اصول پر جو پاؤں کا کام کرے گی اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آرہے ہیں اول تو سرے سے پیدا ہی نہ ہونگے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوتے بھی تو وہ اُس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آرہے ہیں۔ انہیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی، بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنی ہوگی جس سے وہ اس اسکیم کو نافذ کر سکیں جو پہلے ہی بنی ہوئی موجود ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ نام سازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگار کر دے۔ غرض یہ کہ ان کا نقطہ نظر اس معاملہ میں اُس نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی چپیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پاسکیں، اور وہ چپیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے خانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل، اور سپانوسے فی صدی منحرف، اور نوے فی صدی انحراف پر مہر ہیں، یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اُس منش کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اُس پورے مجموعہ کو جو اس وقت ملاقاتم ہے، مقوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں اور پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی چپیدگی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کبھی نہ پاسکیں گے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۴ء)

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال ہے، "اس وقت مسلمانان ہند دو فرقوں میں مبتلا ہیں۔ اڈل کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روح اسلامی سراسر مفقود ہے۔" مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کر لے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے، اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانان ہند کی قومی رستی ختم ہو جائے۔ لہذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی ہم درپیش ہے اور یہ انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر

زبردستی مستطہ ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ راستے دہندوں کے دوٹوں پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور لوہاؤں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب :- آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے، اس لیے آپ کو صرف دو ہی نکتے نظر آتے ہیں جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔ حالانکہ اگر آپ فرد وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی نکتے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر بھوم کیے ہوئے ہیں، اور یہ ایک نظری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو مل کر رہی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی پھراتے۔ اس سزا سے اگر مسلمان بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مستطہ ہوئے ہیں، اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انہیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تذبذب چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سد باب نہ ہوگا، بلکہ ہر تذبذب چید اور فتنے برپا کر دے گی۔

آپ نے جو سوال جماعت اسلامی کی توجہ اور فیصلے کے لیے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ پہلے آپ اس جماعت کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر

اور ازلی وابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی تلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگان خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت اُن اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر مٹا کر پوری جمیعتِ خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جماتے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر اُن طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے اُن ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں بھی آپ ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیں۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصالحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لاتے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور (Sovereignty of the People) کے اصول پر قائم ہوا ہے، اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کہ ہمارے عقیدہ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند (Final Authority) خدا کی کتاب کو مانا جاتے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین

ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامہ مسلمان اس حقیقت سے ڈھول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم ترین گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے میں موجود نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصلحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں، اور دوسری طرف خود اپنے دوڑوں سے اُن لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے آئینی اختیارات خصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا ساز اور اس اصول کے منوانے پر صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی راستے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

(ترجمان القرآن - ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۷ء)

۱۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی نے تقسیم کے بعد انتخابات میں حصہ لینے اور اسمبلیوں کی رکنیت حاصل کرنے کو اس وقت تک جائز تسلیم نہیں کیا جب تک کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) پاس کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم نہ کر لی۔

نظام کفر کی قانون ساز مجلس میں

مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال :- ”آپ کی کتاب ”اسلام کا نظریہ سیاسی“ پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو پیش ہو گئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر مبنی ہوتی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شرعیت کے خلاف ہے۔ مگر ایک مشتبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کر لیں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاسکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکل غیردوں کے حوالے ہو جانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں گے، پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟“

جواب :- ”آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، سب سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امر حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود

واضع حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں وہ کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بناتے گئے تھے؟ آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اُس امر حق کو جو قرآن سے ثابت ہے، دنیا کے سامنے پیش کریں، اُس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اُس پر قائم کریں اور دنیا میں اُس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اُس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی مخالفت کریں اور اُس کو اپنائیں اور اُس کو مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟ اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں۔ اور ان کا مفاد اگر اسی غلطی سے وابستہ ہے تو وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اُس کی پروا کی جائے، اور ایسی صورت حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ مل کر جہنم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امر حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود غلط حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسیلوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظام حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے اور اگر نظام باطل کے کل پرزے ہم نہیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشہ مزید کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظام حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے

وہ دینِ حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے،
سیرتِ رسولؐ کے ذریعہ سے اور اخلاقِ اسلامی کے ذریعہ سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی،
اور تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں وہ صورتیں پیش آسکتی ہیں،

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان، جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس ملٹی نیشنل
اور ذہنی اور مادی قوتوں اور طاقتوں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، ایک وقت ہماری اس
دعوت کو قبول کر لیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔
اگر ایسا ہو جائے تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں
یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کے ہاتھ آجائے گا، ہندوستان
میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی
حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی
بھی کاپیا پلٹ جائے گی اور خوردہ تو میں تک جو آج ملکی دنیا پر چھاتی ہوتی ہیں، مسخ ہونے سے
محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے، اور یہی اس وقت متوقع بھی ہے، کہ مسلمانوں میں
سے بتدریج قعودی قعودی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری
اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظم ہو کر ایک طاقت بنے،
عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے آ
رہے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا
آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے
کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ بچتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل
جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بڑھ
رہے ہیں اور اگر ہم بھی امرِ حق اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض قوم اور اس کے
مفاد کی فکر میں ان باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو

رہی ہیں تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو غیر کیا بلند ہو گا، مسلمان قوم اُس ذلت و خواری اور اس
 پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرقت اس لیے مبتلا ہوئی ہے
 کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے منہ موڑا۔

(ترجمان القرآن - محرم ۱۹۵۵ء - دسمبر ۱۹۵۵ء)

مجلس قانون ساز کی رکنیت شرعی نقطہ نظر سے

سوال: کیا مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ پڑ رہا ہے، حتیٰ کہ علماء تک کا مطالبہ یہی ہے۔ اگرچہ مجھ کو عبادتاً ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں، مگر تاوقتیکہ معقول وجوہ پیش نہ کر سکوں، ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔

جواب: اسمبلی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانہ میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگان ملک اپنے معاملات کے متعلق خود تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اصول وضع کرنے اور ان کے مطابق تفصیلی قوانین و ضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریہ سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی جز یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے، ہدایت اور حکم

دنیا اس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانون زندگی اخذ کریں، نیز اگر اپنی آزادی سامنے استعمال کریں بھی تو ان حدود کے اندر کریں جن حدود میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریے کی رو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملات زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار پاتی ہے، اور اس نظریہ سے ہٹ کر اول الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدہ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جمہوریاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے، کیونکہ دوست دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی دلتے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدہ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے۔

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مستطاب ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ نہ لیں اور نظام حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جاسکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھہرایا جائے۔ اضطراب کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطراب کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطراب کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور اس اضطراب کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس

۱۔ اس مسئلہ کو جو دو گ تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں وہ میری کتاب "اسلامی ریاست"

ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

دقت مسلمانوں پر مسلط ہوا ہے، جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیلِ اضطراب بنا رہے ہیں، وہ آخر ان کی اپنی ہی فضلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجا تے اس کے کہ اپنا سرمایہ قوت و عمل اس نظام کے بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں، وہ اس اضطراب کو محبت بنا کر اسی نظام کے اندر حصہ دار بننے اور بچنے بچھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۹۵۵ء۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

پُر امن انقلاب کا راستہ

سوال: ”ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم صحیح نظریات کی توفیح فرما کر انہیں صاف کر دیجیے۔“

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے چوتھے پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدارِ کل مستقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے، اس قسم کا طریق کار اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیئے؟ ہمارے لیے تو صورتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسودہ واجب الاتباع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جد گانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے لیے بھی طریق کار اب یہی ہے! واضح فرمائیے کہ میری رہائے

کس حد تک صحیح یا غلط ہے ؟

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی معاملہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں سے نظامِ باطل کو اپنے اصل پر ڈھالا جاسکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہوگا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسئلہ کی توضیح فرمائیے۔

جواب ہے :- ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسا وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اُسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریم نے اس پر لعنت بھیجی، اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسف کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریم کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ رک کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ فرماتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح اگر کبھی ہم کو یہ موقع ہو کہ ہم راستے عام کی تائید سے نظامِ حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اُس کو فاضلِ اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اُس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت

ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدہ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی راستے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز رٹ سے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم یہ طریق کار صرف اُس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:

اولاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض راستے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جاتا ہی عملاً اُس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔
ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے ہاشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت اُس کو چلانے کے لیے نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

(ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۵ھ - دسمبر ۱۹۴۵ء)

۱۹۴۶ء کے انتخابات اور جماعت اسلامی

۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر مسلم لیگ کے ایک پُر جوش حامی نے جماعت اسلامی کے مسلک پر تنقید کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا۔ ذیل میں ہم وہ مضمون اور اس کا جواب جوں کا توں نقل کر رہے ہیں :

کچھ دنوں سے اخبارات میں مولانا مودودی صاحب کے اُس مضمون کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایک سوال کے جواب میں صدر روزہ ”کوثر“ مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے صفحہ ۳ پر شائع ہوا ہے۔ مولانا نے انتخابات کی شرکت اور راستے وہی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ :

”دعوت اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، ہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصیبت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دینا ہے جس کے لیے کوئی بلا ترسند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدہ

توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت، جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند
خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الہی کے ماتحت ہو
کہ اُس سے بے نیاز؟

دورِ حاضر کے علماء و حضرات، لانگریسی ہوں یا احراری، بریطوی ہوں یا دیوبندی، مختلف
سیاسی نظریات رکھنے کے باوجود اسمبلیوں کے اشتراک و انسلاک میں متفق العمل ہیں۔ صحت انکار
اور بائیکاٹ کی آواز پٹھانکوٹ کے سوا کہیں سے نہیں اُٹھی اور وہ بھی اب تک محض ایک انکار ہے۔
ایک مسئلہ کی حیثیت سے یہ معاملہ تشنہ بحث ہے۔ سطور ذیل میں اجمالاً طور پر اپنے تاثرات پیش
کرتا ہوں، ممکن ہے اہل علم اصحاب کی توجہ سے اس کے جزئیات دلیل و برہان کے ساتھ مزید روشنی
میں آجائیں۔

اگر ممبران اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس
امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو یہ اختیار حاصل
ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں "آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ
بھی ہو کتاب الہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز؟ کیونکہ آخر زمین کے منہ پر خدا کے بندوں
ہی کو خدائی قانون کی ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے۔ اگر حکم و اختیار نیک بندوں کے ہاتھ میں آجیگا
تو یقیناً خدا کی زمین پر نیکی کی اشاعت ہوگی اور بُرائی مٹتی جائے گی۔ اَلْكَذِبُ يَكْبِتُ
فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالصَّالِحَاتِ وَنَهَوْا
عَنِ الْمُنْكَرِ۔

لہذا اس مقصدِ اعلیٰ کے حاصل کرنے کے لیے ایجابی پہلو تو یہ ہو کہ ایسے لوگوں کے منتخب
ہونے کی کوشش کی جائے جن پر رضائے الہی کے ماتحت کام کرنے کا گمان غالب ہو، اور سبھی
پہلو یہ رہ کہ ایسے لوگوں کے اختیار و اقتدار میں شدید مزاہمت کی جائے جن کی نسبت اس کے
برعکس چلنے کا خیال ہو۔ علیندیگی، بائیکاٹ اور تعطل کا ہوا کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔
اگر نیک لوگوں کے برسرِ اقتدار آنے میں تعاون نہ کیا جائے تو تعاون علی البتر کے خلاف ہے
اور اگر خالی چھوڑ کر بڑوں کو موقع دے دیا جائے تو سکوت عین الحق کا جرم ثابت۔

ہاں اگر موجود جماعتوں میں کوئی جماعت تعاون کی مستحق اور اہل نہیں تو جماعت اسلامی کو میدان میں آنا چاہیے تاکہ یہ لوگ اپنا سارا زور اس اصول کے منوالے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہو اور قانون سازی کتاب الہی کی سند پر مبنی ہو۔ تاہم اس سارے زور کے لیے باتیکاٹ اور تختہ کتب کا میدان تلاش کرنا یقیناً وضاحت طلب ہے۔

اگر ہر معاملہ کو وقتی قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کر دی جائے تو ایک ایسی دنیا مسلمانوں کے آباد ہونے کے لیے تلاش کرنی پڑے گی جو اس میل دہرا اور وقت و زمان کی قیود سے ماوراء ہو۔ نیز یہ بھی خیال کرنا پڑے گا کہ کیا اسلامی نظام کی ہمہ گیری اس سے قاصر ہے کہ وقتی مسائل کو اپنے ابدی دائرہ قوانین کے ماتحت حل کر سکے۔ علیحدگی کسی صورت میں بھی اس مسئلہ کا حل نہیں کہلا سکتی۔ یا اس نظام کے ساتھ منع و مزاحمت کا معاملہ ہو یا قبول و اذعان کا تعلق۔ اگر پوری مزاحمت ناممکن بھی ہو تو بھی مسلمان حتی الامکان کام کرنے کے لیے مجبور ہے۔

اس سلسلہ میں اکثر اضطرار و اختیار کی بحث پیش آتی ہے۔ سواس کی نسبت عرض ہے کہ محترم مولانا مودودی صاحب نے اپنی اکثر تحریروں میں اظہارِ انوس کرتے ہوئے بالوضاحت لکھا ہے کہ بد قسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے نافذ ہو۔ واقعی موجودہ حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اور اس قانون و تمدن میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہ بھی ناممکن کہ ہم اپنی تمام قوتوں اور مال و املاک کو نظام باطل کا آلہ کار بننے سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور ہندوستان کے وسیع و عریض بر اعظم میں زمین کا ایک اچھ بھر ٹکڑا ایسا تلاش کر سکیں جو اس نظام کے اثر سے مآف نہ ہو۔ تاہم گورو اسپور کے ضلع میں قصبہ پٹھانکوٹ کے قریب زمین کے ایک ٹکڑے کو دارالاسلام بنایا جاتا ہے اور اس شیطانی نظام کی تمام خرابیوں کے باوجود اس کے اندر وہ دارالاسلام ہے۔ اور یہ اسی جمہوری کا نتیجہ ہے کہ جو چیز مکمل حاصل نہ کی جاسکے اس میں سے جس قدر حاصل ہو سکے کر لی جائے۔

پھر مولانا نے دارالاسلام کے نظام کی توضیح فرماتے ہوئے اس سے رہبانیت اور قدامت پرستی کے شائبہ کو بھی رفع فرمایا ہے۔ لکھا ہے کہ دارالاسلام کے قیام کا مقصد اکثر غلط فہم دینداروں کی طرح یہ نہیں کہ تمدن و حضارت کی جو حالت صحابہ کرام کے زمانہ میں تھی بالکل وہی پیدا کی جائے

اور ایک مُتَحَجِّرِ صُورَت میں قائم رکھی جائے بلکہ آپ آیۃ اَعَدُّوا لَهَا مَا اسْتَطَعْتُمْ
مِّنْ قُوَّةٍ وَ مِّنْ رِّبَاطٍ الْخَيْلِ تُزْهِبُونَ بِهَا عُدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ
سے استدلال کر کے قوانین طبیعی کی ہر قسمی قوت و سجاد کو شرعی قانون کے ماتحت استعمال کرنا ہی
عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرمایا ہے کہ:

”یڈیو بجائے خود ناپاک نہیں، ناپاک وہ تہذیب ہے جو یڈیو کے ڈاکٹر
کو داروغہ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افتراء بناتی ہے۔“
(رسالہ طرار الاسلام، صفحہ ۲۰)

اور فرمایا:

”یہ طائفیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اُس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا، خواہ
وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے
مقصد کی پاکی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا تصور ہے
اور اس تصور کی سزا اسے جگتنی پڑے گی، کیونکہ اس عالم اسباب میں خدا کی جو
سُنّت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا۔“

(رسالہ مذکور صفحہ ۲۰)

اب گزارش ہے کہ اسمبلی کی غیر مشروط قانون ساز قوت یا حکومت کے اختیار کی تلوار کا قبضہ
اگر آپ جیسے صحیح الحیال اصحاب کے ہاتھ میں آنے کا موقع مل سکتا ہے تو اسے مسترد کر دینے اور اس
سے امکانی فوائد حاصل کرنے سے باز رہنے کے لیے وجہ جو از کیا ہے؟ مزاحمت باطل اور
اعلائے حق کے مصائب سے عہد اٹھارہ کش ہو کر گوشہ عافیت اختیار کرنے کی یہ ایک دانشمندانہ
کوشش تو نہیں۔

اگر پاک جماعت اپنے پاک مقاصد کو لیے بیٹھی رہے اور ناپاک مقاصد رکھنے والے لوگوں
کے لیے عہد اٹھارہ چھوڑ دے اور نظام باطل کی گاڑی کے سامنے مزاحمت پیدا کرنے کے بجائے
اس کے پیچھے سے اپنے آپ کو بے حس و حرکت باندھ دینا ہی دین داری اور خدمت اسلام
یقین کر کے تو کیا اس عالم اسباب میں خدا کی سُنّت کے مطابق اس تصور کی سزا بھگتنی نہیں

پڑے گی؟

یا تو نظام باطل سے کامل بے تعلقی عملاً حاصل ہو جائے اور مسلمان ایک خالص اسلامی ماحول پیدا کر لے، لیکن اگر یہ صورت ناممکن ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر یہ کون سا مسلک ہے کہ وہ تعاون تو اضطراراً اجازت رکھا جاتے جس سے یہ نظام کا حقہ متمتع ہو کر دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے، اور ان صورتوں سے اختیاراً دست کشی کر لی جائے جہاں کسی قدر اسلامی مفاد بھی حاصل کرنا مقصود ہو۔ اگر اسم اور مسمیٰ میں کسی وجہ تسمیہ کا ہونا لازم ہے تو ایسی روش کو مسلک (چلنے کی راہ) کے بجائے بقول ”کوثر“ موقت (ٹھہرنے کی جگہ) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

”کوثر“ کے اسی نمبر کے افتتاحیہ میں مولانا نضر اللہ خان عزیز نے بھی اسی مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جس کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں ادب بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور جمود و تعطل کا شائبہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ آپ جہاد کے لیے دو شرطیں مقرر فرماتے ہیں۔ لکھا ہے:

”اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ با اختیار امیر کی قیادت میں ہو۔ کسی دوسرے نظام قاهر و مستط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی با اختیار امیر کا وجود ناممکن ہے قائل کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔“

یہ حکم مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ با اختیار امیر کی قیادت کے بغیر جہاد فساد ہے اور امیر کا وجود کسی دوسرے قاهر و مستط نظام کی موجودگی میں ناممکن ہے۔

اس شرط کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد نظام حقہ قائم ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قاهر و مستط نظام کے ارکان خود بخود ہربانی کر کے مسلمانوں پر سے اپنا تہر و تسلط اٹھالیں اور انہیں کامل آزاد ماحول میں چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے کہیں بڑھا رہ جائیں تاکہ مسلمانوں

لے یہ معنی ایک غلط بحث ہے۔ یہ یہ کوثر نے اس موقع پر جس جہاد سے بحث کی ہے وہ جہاد بالسیف ہے نہ کہ وہ جہاد جو جذبہ ہمد کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے جہاد کے لیے با اختیار امیر کی شرط کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (قدیم)

کو ایک با اختیار قیادت قائم کرنے کا شرعی حق حاصل ہو جاتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر جہاد کی ضرورت رہے یا نہ رہے۔ بہر حال جہاد حلال ہونے کی شرط یہی ہے۔

اگر یہ شرعی فتویٰ کسی غیر متقی کو مشتبہ نظر آئے تو پھر سو اس کے چارے کار نظر نہیں آتا کہ جس طرح نظام باطل کے منفع و مزاحمت کے باوجود ایک غیر اسلامی ماحول میں دارالاسلام قائم کرنے کی کوشش مناسب و موزوں بلکہ ضروری نظر آتی ہے اور اس نظام کے پیدا کردہ تمام آلات و ٹولی سے کام لینا عین اسلام اور کام نہ لینا ہلاکت قرار دیا جاتا ہے، وہاں اسمبلیوں سے اپنا حصہ حاصل کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہی تقاضائے عقل و انصاف ہے۔

مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ نقصان اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اگر دیہات کے ناخواندہ زمینداروں کے سامنے، جو آج تک ذات پات کی مصیبت میں اعراب عرب سے کسی حالت میں کم نہیں تھے، ایک طرف کوئی غیر متشرع نواب ہوتا اور دوسری طرف ایک عالم دین تو یقیناً وہ عالم دین کج کامیاب کر کے چھوڑتے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے اور عوام کو مذہبی قیادت سے محروم رکھنے کی ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ہے جو محض اپنے آرام کی خاطر علماء کو ہائیکٹ کا مشورہ دے رہے ہیں۔

یوسف صدیق علیہ السلام نے اِجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ کا مطالبہ کر کے غیر اسلامی حکومت کے ایک شعبہ کو ہاتھ میں لیا اور بہترین انتظام کر کے دنیا کو ہلاکت سے بچایا۔
موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے اَنْ اَكْذِبْ اِلَيْ عِبَادَكَ لِلّٰہِ اور اَنْ اَرْسِلَ مَعَنَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ کے مسلسل مطالبات کر کے ایک غیر مہذب اور غیر صالح بھیڑ کو اسی ملک کے ایک حصہ میں رکھ کر اصلاح و تہذیب کی کوشش کی۔

مریض کی صحت انہی اخلاط کی تبدیلی پر منحصر ہے جو مریض کے وجود کے اندر موجود ہیں۔ ہمسائے کے گھر میں خواہ کسی قدر بہترین اور قیمتی ادویات کا انبار عمدہ سے عمدہ قرینہ اور ترتیب ہی سے کیوں نہ لگا دیا جائے دوسرے گھر والا مریض صحت یاب نہیں ہو سکتا۔

جواب

یہ مضمون دراصل متعدد مغالطوں یا غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں ہم صرف تین بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) صاحب مضمون کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ ”اگر ممبران اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں، یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جاتے“ بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تھوڑی سی تحلیل کرنے سے ہی یہ حقیقت باآسانی کھل جاتی ہے کہ یہ مغالطہ یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یا انسانوں کے کسی گروہ کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنا یہ اصول قرار دے اور اس نظریے پر کاربند ہو کہ وہ اپنے عمل میں خود مختار ہے اور خود اپنی خواہش اور خواہید کے سوا کسی آسمانی ہدایت سے امر و نہی کے احکام لینے اور اپنے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ ان دونوں مفہومات میں سے پہلے مفہوم کی آزادی تو انسان کی فطری مسئولیت و ذمہ داری کی اساس ہے جس کی بنیاد ہی پر وہ شرائع الہیہ کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ یہ آزادی مومن ہونے کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح کافر ہونے کے لیے اسے ایمان و اسلام کی راہ میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور کفر و معصیت کی راہ میں بھی۔ اس کو بجائے خود نہ کفر کہا جاسکتا ہے نہ ایمان نہ بلکہ یہ ایک شرط مقدم ہے جس کے حصول کے بغیر کوئی فرد یا گروہ نہ ایمان کی راہ پر چل سکتا ہے نہ کفر کی راہ پر۔ بخلاف اس کے دوسری قسم کی آزادی قطعی طور پر ایک کافر نہ آزادی ہے اور کسی فرد یا قوم کا اسے بطور ایک نظریہ و مسلک کے اختیار کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کے بجائے کفر کی راہ اپنے لیے انتخاب کی ہے، کیونکہ کفر اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہدایت الہی سے بے نیاز قرار دے کر اپنے نظریات و

اعمال میں خود مختاری کا طریقہ اختیار کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جس دستور پر حکومت خود اختیاری کا نظام اس وقت قائم کیا گیا ہے اور جن خطوط پر آئندہ اس دستور کا بھروسہ کرنا ہو رہا ہے، اس کی بنیاد آیا محض پہلی ہی قسم کی آزادی ہے یا دوسری قسم کی آزادی بھی اس میں شامل ہے؟ جو شخص ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ پورا نظام دنیوی، لادینی ریاست (Secular State) کے نظریہ پر مبنی ہے، اس کا مزید دستوری ارتقا ہو رہا ہے اس میں بھی یہ بات اصل و اساس کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ اسی دنیوی، لادینی ریاست کے قاعدہ پر مبنی ہوگا، یعنی اس میں باشندگان ملک کو صرف یہی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ اپنے لیے جو دستور چاہیں اختیار کریں، بلکہ اس کی بنیاد لازماً اس نظریہ پر قائم ہوگی (اور آج بھی ہے) کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی ہے اور قانون سازی میں راستے عام سے بالاتر کسی کتاب الہی اور ہدایت خداوندی سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ پورا نظام دراصل ایک کافرانہ نظام ہے، اس کی بنیاد اسلام کی بنیاد سے متصادم ہے اور اس کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں داخل ہونا قطعاً ایمان کے خلاف ہے۔ یہ آواز اگر صرف ”پٹھان کوٹ“ سے اٹھی ہے تو اس میں بے چارے ”پٹھان کوٹ“ کا کوئی قصور نہیں، قصور ان دوسری جگہوں کا ہے جہاں سے یہ اٹھنی چلی ہے متقی مگر نہ اٹھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم اس نظام کے اندر داخل ہو کر اس کو اسلام کی طرف پھیر لیں گے۔ اس کے اندر داخل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پہلے اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کیا جائے، اور اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی نظریے سے انکار کا ہم معنی ہے۔ لہذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ باہر سے اس کے خلاف لڑیں اور اپنی تمام تر کوشش پہلے یہ اصول

لے یعنی اس کی کار فرمائی دکار کنی میں شریک و حصہ دار بن کر۔
لے باہر رہنے سے ہماری مراد حکومت کی مشینری سے باہر رہنا ہے، نہ کہ اس تمدن سے باہر نکل جانا جو اس حکومت کے تحت چل رہا ہے۔

منوانے میں صرف کریں کہ قانون سازی کتاب الہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے نہ کہ اس سے آزاد، اور باشندگان ملک کی حکومت خود اختیاری دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں خود اختیاری ہونی چاہیے، نہ کہ خدا کے مقابلہ میں۔ اصول حیثیت سے قطع نظر عمل حیثیت سے بھی یہ تدبیر قطعاً ایک غلط تدبیر ہے کہ اس کا فرانہ نظام حکومت کی مجالس قانون سازی میں داخل ہو کر ہم مذکورہ بالا اصول منوانے کی کوشش کریں۔ یہ پارلیمنٹری طریق کار صرف اُن جماعتوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو اصول میں رائج الوقت نظام سے متفق ہوں اور صرف نسروعلی اصلاحات کے معاملہ میں اپنا انگ مسلک رکھتی ہوں۔ لیکن جو جماعت سرے سے اس نظام ہی کو اصولی طور پر بدل ڈالنا چاہتی ہو اس کے لیے پارلیمنٹری طریق کار کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کو تو لازماً انقلابی طریق کار اختیار کرنا پڑتا ہے، یعنی یہ کہ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف عام بے چینی پیدا کرے اور اس کو بدلنے کا ایک زبردست داعیہ باشندگان ملک میں ابھار دے، پھر وقت کے حالات کے لحاظ سے ایسی تدبیر اختیار کرے جس سے نظام حکومت عملاً تبدیل ہو سکے۔

(۲) دوسری غلط فہمی جس میں صاحب مضمون مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس نظام کی اصلاح اسی طرح اور صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اُن اسمبلیوں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے جو اس کا فرانہ دستور پر بنائی گئی ہیں، اور چونکہ جماعت اسلامی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت نے محض علیحدگی و اجتناب کا سبب پہلوا اختیار کر رکھا ہے جس سے اصلاح تو کسی طرح نہ ہوگی البتہ اقتدار کی تلوار بُرے لوگوں کے ہاتھ میں جا کر باطل کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ جانے میں استعمال ہوگی۔ اس غلط فہمی میں نہ صرف صاحب مضمون مبتلا ہیں، بلکہ بکثرت لوگ اسی طرز پر سوچ رہے ہیں اور اس کی اصل وجہ سطح بینی اور قلت فکر و تدبیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل یہ حضرات اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کروڑوں مسلمانوں کے موجود ہوتے ہوئے موجودہ کانسرانہ نظام اس ملک میں آخر قائم کیسے ہو گیا؟ اور کیا وجہ ہے کہ ملک کا سارا دستوری ارتقا انہی کا فرانہ اصولوں پر ہوتے چلا جا رہا ہے؟ اس سوال پر اگر انہوں نے کچھ غور کیا ہوتا تو ان پر

خود یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اس خرابی کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً شعورِ اسلامی مردہ یا نیم مردہ ہو گیا ہے، ان کے اندر اسلامی دستورِ حیات پر چلنے اور اس کے لیے جینے اور مرنے کا ارادہ مفقود یا فقدان کی حد تک ضعیف ہے۔ اور انہوں نے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کو بھی صحیح نظامِ زندگی سمجھانے اور اس کی طرف دعوت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی اپنی زندگی بھی فکری، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بیشتر غیر اسلامی ہو گئی ہے اور ہندوستان کا پورا نظامِ تمدن و سیاست بھی کافرانہ اصولوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اس خرابی کا اور اس کے بُرے نتائج کا مداوا کرنے کے لیے اس قسم کی تدابیر سے کچھ کام نہیں چل سکتا کہ اس کافرانہ نظام کی مشینری میں ہم چند نیک مومنوں کو بھجوانے کی کوشش کریں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر اس اصولی سوال کو نظر انداز کر بھی دیا جاتے کہ ایک نیک مومن اس مشینری کی کافرانہ بنیادوں کو تسلیم کر کے اس میں داخل ہونے پر آمادہ ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور اگر تقیہ کے شیعہ طریقہ کو اختیار کر کے چند مومن اس نظام میں داخل ہونے پر آمادہ ہو بھی جائیں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس تدبیر سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔

بھودی نظام میں کوئی گروہ اپنے اصول کے مطابق نظامِ حکومت کو اس وقت تک ہرگز نہیں چلا سکتا جب تک کہ وہ حکومت کی مشینری پر قابض نہ ہو۔

حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجلسِ قانون ساز میں اس گروہ کو غالب اکثریت حاصل ہو۔

اس غالب اکثریت کا حصول بحالاتِ موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اہل ایمان کے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس وقت اسلام اس ملک میں ایک ایسی اصولی تحریک کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے علمبردار باشندگانِ ملک سے محض اپنے اصول کی بنا پر عام اپیل کر سکتے ہوں اور یہ امید کی جاسکے کہ وہ اپنی دعوت کو مقبولِ عام بنا کر اکثریت کی تائید حاصل کر لیں گے۔

لی الحال تو اسلام ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی دوسری قوموں سے کشمکش ہو رہی ہے۔ لہذا اگر کوئی گروہ اس وقت خاص اسلامی اصول سے کراختیابی مقابلہ میں اُترے گا تو مسلمان قومیت کے پرستاروں کی طرح اس کو بھی صرف موجودہ مسلمان قوم ہی کے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑے گا،

اور معلوم ہے کہ یہ قوم ملک کے بڑے حصے میں بکھرتے خود اقلیت میں ہے۔

رہے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، تو اگر بالفرض وہ پاکستان کی صورت میں خود مختار ہو جاتیں اور ایک مستقل صاحبِ حاکمیت اسٹیٹ کی حیثیت بھی ان کو حاصل ہو جائے تب بھی خالص اسلامی اصولوں پر جو گروہ کام کرنا چاہتا ہو اس کے غالب اکثریت حاصل کرنے کا بہت محنت و محنت ہو جائے گی۔ کیونکہ ان علاقوں میں اس کے اکثریت حاصل کرنے کا تمام تر انحصار مسلمانوں کی رائے عام پر ہے اور مسلمانوں کی رائے عام اس وقت بالکل ناگزیریت یافتہ ہے، اسلامی فہم و شعور سے بہت بڑی حد تک غریب ہے اور اسلامی مقاصد کی بہ نسبت اپنی دنیوی خواہشات و اغراض کے عشق میں بڑی طرح مبتلا ہے۔ اس رائے عام کی تائید سے کسی ایسے گروہ کا اکثریت کے ساتھ منتخب نہ تقریباً ناممکن ہے جو بے لگ طریقہ سے خالص اسلامی اصولوں پر کام کرنا چاہتا ہو۔

پھر اگر بالفرض ایسا ایک گروہ اکثریت میں منتخب ہو بھی جائے تو جو حالات اس وقت پاتے جاتے ہیں ان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جاسکے۔ کیونکہ جنتِ الحق میں رہنے والے لوگ اپنے غریبوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں، لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک حکومت ہوں گے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں اُن کی تعداد اتنی کم اور اُن کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جاسکے۔

لے واضح رہے کہ یہ مضمون فروری ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا جب پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا خیال تک پیدا نہ ہوا تھا، اور مسلم لیگ کے تجویز کردہ مسلم علاقے میں اُسام بھی پورا کا پورا شامل تھا۔ اُس وقت مجوزہ پاکستان کے مغربی حصے میں غیر مسلموں کی تعداد ۹۳ء و ۲۴ فی صدی اور مشرقی حصے میں ۳۱ء و ۴۰ فی صدی تھی۔ مزید برآں دونوں حصوں میں غیر مسلموں کو معاشی، سیاسی، تعلیمی اور انتظامی حیثیت کے اتنی قوت حاصل تھی کہ ان کی اس تعداد اور اس طاقت کی موجودگی میں پاکستان کے اندر اسلامی ریاست کا خیال پیش (باقی صفحہ ۲۵۲ پر)

ہم ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہمارے نزدیک وہ تدابیر بالکل لاعاصل ہیں جن سے ہمارے محترم معتمدوں نگار اور ان کے طرز پر سوچنے والے بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے قیام کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آ رہا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کر لیں اور اپنی ساری قوت اُس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعہ سے نظام زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں حقیقی صورتِ معاملہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی ہیں وہ اپنے طرزِ عمل میں آزاد ہیں، جس طرح وہ کام کرنا چاہیں کریں، ہم ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ پچھلے زمانہ کی غلطیوں کی بدولت اس وقت فوری طور پر ایسی کوئی قوت فراہم نہیں کی جاسکتی جس سے واقعات کی موجودہ رفتار پر وہ کم سے کم اثر بھی ڈالاجائے جو اسلام کے مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اس لیے ہم اس وقت کی سیاسی کارروائیوں میں دخل دینا تغیرِ وقت بھی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے بھی اس سے احتراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم اپنے اصول سے ہٹے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سیاسی معاملات کا فیصلہ خواہ کچھ ہو جائے اور اس کے نتائج آگے چل کر خواہ کتنے ہی خوفناک نکلنے نظر آئیں، لیکن اگر ہم اُس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک عملدرآمد کرنے میں کامیاب

(پیشہ حاشیہ ص ۲۵۱ سے) کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا وہ ہندوستانی اکثریت کے علاقوں میں تھا۔ درحقیقت حالات نے پٹا اُس وقت کھایا جب بنگال، آسام اور پنجاب تینوں صوبے ۱۹۴۷ء کے وسط میں تقسیم کر دیئے گئے، اور مزید تعزیر اس وقت ہو جب میں تقسیم ہند کے موقع پر آبادیوں کا بھری تبادلہ ہوتا ہو کسی اسکیم میں شامل نہ تھا۔ اس طرح مشرق میں مسلم آبادی کا تناسب ۸۰ فی صدی اور مغرب میں ۹۸ فی صدی ہو گیا۔ اس کے باوجود پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے میں جیسی جیسی دشواریاں پیش آئی ہیں ان سے اب کوئی بھی نادانقت نہیں ہے۔ (جدید)

ہو گئے جو ہمارے پیش نظر ہے تو واقعات کی رفتار بالآخر ٹپٹ کر رہے گی اور ان سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی جو اس وقت کے اجتماع سے ہمیں پہنچیں گے۔ ہمارا پروگرام مختصر یہ ہے:

(۱) مسلمانوں کے اس مخلوط انبوہ میں سے صانع اہل ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے اور ان کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ مسلم قومیت کے بجائے خود اسلام کو ایک اصولی تحریک کی حیثیت سے لے کر اٹھ سکیں۔

(ج) اس گورہ کے ذریعہ سے عالمہ مسلمین میں اسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تیز پیدائی جائے، ان کی اخلاقی قدروں (Moral Values) کو تبدیل کر کے خالص اسلامی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں، اُن میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کا مضبوط ارادہ (موسوم اور مبہم ارادہ نہیں بلکہ واضح اور شعوری ارادہ) پیدا کیا جائے اور ان کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اسلامی طرز پر کام کرنے والی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انہیں بیوقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے بوٹ نہ حاصل کر سکے، اور اگر جمہوری طریقے قابل عمل نہ ہوں تو وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں۔

(۳) مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودہ سیاسی کشمکش سے جو تعصبات ہندوستان کے غیر مسلموں میں پیدا ہو گئے ہیں اُن سے بالاتر ہو کر غیر مسلموں کے سامنے اسلامی نظام زندگی کو اوسان اخلاقی بنیادوں کو جن پر یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے، پیش کیا جائے اور پوری حکمت، جانفشانی اور خالص ٹھہریت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں یہ ممکن ہو کہ غیر مسلموں کا بھی ایک صانع عنصر اسلامی نظام زندگی کا معتقد اور اس کے قیام کا طالب ہو جائے اور اسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ رہے بلکہ اُن قوموں کی رائے عام بھی اس کی مؤید ہو جائے جو آج غیر مسلم ہیں اور جن کو مسلمانوں کی موجودہ قومیت پرستانہ جنگ نے اسلام کے خلاف سخت تعصبات میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس پروگرام میں جب ہم ایک قابل لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے (اور ہم یقین ہے کہ جس طرز پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے آخر کار انشاء اللہ ہم کو کامیابی ضرور ہوگی) تب ہم ملک

کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اس وقت یہاں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستور حکومت میں کوئی اصولی تغیر صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ راستے عام اُس نفسیئر کی خواہش مند ہے؟ اگر یہ صورت ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستور حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی راستے عام کے سامنے پیش کریں گے، اس تغیر کے لیے اسے تیار کریں گے، اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) منعقد کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ راستے عام کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پر دو گرام کو ایک بڑا المبا پر دو گرام سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کے پورا ہونے میں دو تین صدیاں لگ جائیں گی، اس لیے اُن کے نزدیک یہ کوئی عملی پروگرام نہیں ہے بلکہ وہ اسے خیالی پلاؤ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں سارا دیر طلب کام صرف اُس ابتدائی صانع گروہ کی تنظیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا موزوں محرک بن سکے۔ ایسے ایک گروہ کی تنظیم کے بعد یہ تحریک اس طرح پھیلے گی جیسے خشک گھاس میں آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تعین کی پیشین گوئی تو نہیں نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی مرحلہ کے گزرنے کے بعد ہماری منزل مقصود اتنی دُور نہیں رہے گی جتنی بہت سے لوگ کام کیے بغیر صرف اپنے خیال میں دُور سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اگر وہ دُور بھی ہو تو چونکہ منزلِ حق وہی ہے اس لیے ہم اس کی طرف دوڑتے ہوئے مرجانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ جانتے بوجھتے غلط مگر آسان راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا نادانی کے ساتھ جنتِ الحما کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔

(۱) تیسری غلط فہمی جس میں صاحبِ مضمون کے ساتھ بہت سے سادہ لوح مسلمان مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے دلوں سے صانعِ مومنین کا ایسا گروہ منتخب ہو کر آسکتا ہے جو وقت کی سیاسی فضا کو

اسلامی نصب العین کی طرف پھرنے کے قابل ہو۔ اسی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کیسا نادر موقع مل رہا ہے اور تم اسے کھوٹے دیتے ہو۔ اندھے ایمان کی بات تو دوسری ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جب کوئی تحریک شور و غل اور ہنگامہ کے ساتھ طوفانی رفتار سے چل رہی ہو تو عام طبائع میں اندھے ایمان کاڑجھان پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے لیکن جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈال کر اُس فضا کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم لیگ نے پیدا کی ہے تو ہمیں کسی نادر تو دور کنار غیر نادر موقع کا بھی نشان نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ اُس کے بنیادی تصورات، اُس کا نظام ترکیبی، اُس کا مزاج اور اُس کی اسپرٹ، اُس کا طریق کار اور اُس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمان کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے، اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہوتی ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کر کے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی نظرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اُسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کر کے آپ قومیت کی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں مگر یہ توقع کرنا انتہائی پرہیزگار خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزل مقصود پر جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لیے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیئے ہیں کسی بعیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔

اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازمِ کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل تیار کھڑا ہے۔
ان کی یہ خوشخبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اس صورت میں ہوتی جب کہ
مسلمانوں کی اس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہبیت کا پُر زور اثر
موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کم لیگ
فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز
دور تر لیے جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے
لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے، اور ایسی ناشی باتیں بھی کہہ کر دی جاتی ہیں جن
سے اکابر لیگ کے گہرے جذبہ دینی کا ثبوت ہم پہنچ جاتے، لیکن یہ چیزیں صرف سطحِ بین
لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہیں۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ہر صاحبِ نظر کے سامنے بالکل
بے نقاب ہے۔ لیگ کی قیادت، اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کار فرمائی،
اور اس کی ساری قوت محزر کہ اس وقت مسلمان قوم کے ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو زندگی
کے جملہ مسائل میں دینی کے بجائے دنیوی (Secular) نقطہ نظر سے سوچنے اور کام کرنے والا
ہے، اسلام کے بجائے مغربی اصولِ حیات کا معتقد اور مقلد ہے، دینی تعلق کے بجائے قومیت
کے تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی حمایت و وکالت اسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہر قوم پرست کیا کرتا
ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ گروہ خودِ علانیہ اسلام کے اصول و احکام کی خلاف ورزی
کرنے میں بیباک ہے بلکہ اس کی رہنمائی و سربراہ کاری کی وجہ سے مسلمانوں میں بالعموم اسلام
کے احکام کی خلاف ورزی اور اس خلاف ورزی میں بیباکی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اُن
کی دینی حسِ مُردہ ہر روز ہے اور ان پر یہ ذہنیت بڑی تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے جو
اپنی اصل کے لحاظ سے قطعاً ایک دنیا پرستانہ ذہنیت ہے مگر ”مسلم قوم“ کے مفاد اور
”ملت کی زندگی کے بقا“ کا نام لے لے کر اس پر ”اسلامیت“ کا بھوٹا طمع چڑھایا جا رہا ہے۔
کوئی شک نہیں کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے کی ذمہ داری میں اُن مذہبی رہنماؤں کی نافرمانی
بھی برابر کی شریک ہے جن کے ہاتھ میں تحریکِ خلافت کے زمانہ سے مسلمانوں کی قیادت کی
باگیں تھیں اور جنہوں نے مسلمانوں کے عام احساسات کے علی الرغم ہندوستانی قوم پرستی کے

سراسر غلط مسلک پر اصرار کر کے مسلمانوں کو زبردستی لاندہیب رہنماؤں کی گود میں دھکیل دیا لیکن اسباب خواہ کچھ ہوں، یہ امر سب جانتے خود واقعہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کی ہوئی موجودہ نفاذ اسلام کے لیے کوئی موافق نفاذ نہیں ہے بلکہ انتہائی ناموافق اور ناسازگار نفاذ ہے جس میں خالص دینی نقطہ نظر سے کام کرنے کے مواقع کم اور کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ لیگ کے حلقہ میں ایسے لوگوں کا بھی ایک بہت بڑا گروہ شامل ہے جو اخلاص کے ساتھ مسلمان ہیں اور سچے دل سے سلام کی برتری چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی سادہ لوحی پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بیچارے اُسی نادانی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب ترکی کے بہت سے نیک نیت مسلمانوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کیا تھا اور اس کا بُرا انجام دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی اسی طرح قومی تحفظ کی خاطر (اور مسلمان قوم کا تحفظ تو ایک مقدس مذہبی کام بن ہی جاتا ہے) مصطفیٰ کمال اور اس کی قوم پرست پارٹی کو زمام کار سونپی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مذہبی تاویلیں کر کے لادینی کی طرف اس کی ہر پیش قدمی کو گوارا کرتے رہے، اور یہ بھی وہ بھی اپنا دل یہ سوچ سوچ کر پہلے یا کرتے تھے کہ اس وقت تو قوم کا تحفظ مقدم ہے اور اس کے لیے اللہ اپنے دین کی تائید اس رُخس فاجر کے ذریعہ کر رہا ہے، جب یہ وقت گزر جاتے گا تو انشاء اللہ ہمارا کاروان جادۂ اسلام کی طرف پھر مڑ جائے گا۔ مگر جو کاروان اپنے آپ کو بے دین قیادت کے قابو میں خود سے چکا تھا اسے پھر اسلام کی راہ پر عادی پیمانی کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اب ذرا دینی پہلو سے قطع نظر کر کے محض قومیت کے نقطہ نظر سے اس نفاذ کا جائزہ لیجیے جو مسلم لیگ نے اس وقت پیدا کی ہے۔ اس کا یہ پہلو خواہ کتنا ہی شاندار ہو کہ مسلمانوں میں ایک عام قومی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک مرکزی طاقت سے بظاہر وابستہ ہو گئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیگ کی یہ تحریک محض ایک اضطرابی ہیجان ہے جو ہندو قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خوف سے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا ہے۔ اس ہیجان کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہیں ہے، کوئی واضح مقصد نہیں ہے، کوئی تعمیری سعی نہیں ہے

جو حصول مقصد کے لیے طاقت فراہم کر سکے، کوئی ایسی کارکن جماعت نہیں ہے جو قابل اعتماد سیرت اور ایک منظم فکر رکھتی ہو اور کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو ایک عمومی تحریک کو چلانے کی اہل ہو۔ فی الواقع مسلمانوں میں جو حرکت پیدا ہوتی ہے وہ ایک اور اس کی قیادت نے سوچ سمجھ کر کسی نقشہ کے مطابق پیدا نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی قومی سامراجیت اور ان کے لیڈروں کی تنگ دلائل سیاست سے مسلمانوں میں خود بخود ایک احساس خطر اور ہیجان اضطراب بھڑک اٹھا اور اس حالت میں جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی لیڈر جن کی طرف وہ تحریک خلافت کے زمانہ سے رجوع کرتے رہے تھے، ان کے کسی کام نہیں آ رہے تو جس نے بھی اُسے بڑھ کر ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا اس کا دامن انہوں نے تمام لیا۔ اب یہ قسمتی کی بات ہے کہ اس ہیجان کی حالت میں جو رہنمائی ان کو میسر آئی وہ سب کا نفسوں اور اسمبلیوں کی لڑائی لڑنے کے اور کسی طرز جنگ اور طریق تیاری سے واقف نہیں ہے۔ اور یہ کھیل چونکہ کسی تیاری اور کسی نقشہ کے بغیر کھیلا گیا تھا اس لیے اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی گیر کڑ کی کمزوری اور زیادہ بے نقاب ہو گئی اور ان کی ہوا پہلے سے زیادہ اکھڑ گئی۔ سب سے زیادہ افسوس ناک معاملہ جس نے لیگ کی موجودہ رہنمائی کا انتہائی نا اہل ہونا واضح کر دیا ہے، اشتراکیوں کا معاملہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی وقاداریاں اور ہمدردیاں روس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی رہنمائی کی بائیں تک روس کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی قوم جو اپنے گھر میں آزاد ہونا یا رہنا چاہتی ہو، اپنے درمیان ایسے ایک گروہ کو چھنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتی جو کسی بیرونی طاقت کے اشاروں پر کام کرتا ہو۔ اسی وجہ سے کانگریس نے اس گروہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۷ سے) ہتیا ہو جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مقصد ایک واضح مقصد ہے۔ جس چیز کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ قطعی مبہم ہے اور اس کی اصل تعبیر غالباً ایک جمہوری لادینی اسٹیٹ کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ مگر اس کو محض اس لیے صاف صاف بیان نہیں کیا جاتا کہ سادہ لوح مسلمان جو اسلامی نظام کے قیام کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اس سے مایوس نہ ہو جائیں۔

اپنے اندر سے نکال باہر کیا اور ہندوؤں میں اس کے اثرات پھیلنے کا دروازہ تقریباً بند کر دیا۔ لیکن لیگ جس نے اپنے قابلِ اعتماد کارکن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور جو اس وقت اندھوں کی طرح ہر اس شخص یا گروہ کا سہارا لے رہی ہے جو اس کا الیکشن پروپیگنڈا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے، ان اشتراکیوں کو بے تکلف اپنے اندر سے آتی، اور اس کو کچھ نہیں سوجھا کہ اپنے پاکستان میں وہ ایک ایسی طاقت کے ایجنٹوں کو قدم جملانے کا موقع دے رہی ہے جو ایران پر اپنا تسلط قریب قریب مضبوط کر چکی ہے اور اب اس کے اور پاکستان کے درمیان صرف افغانستان کی بر دی سی دیوار مائل ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کم نظردیت کو یہ کھلے ہونٹے آثارِ خدا ری بھی نظر نہیں آتے کہ یہ کمیونسٹ جو ہندوستان میں بڑے مسلمان قوم پرست بنے ہوئے ہیں، ایران اور ترکی پر روس کی دست درازیوں کے خلاف ایک صورت نہیں کہتے بلکہ انہیں کو حق بجانب اور ایران و ترکی کو قابلِ الزام ٹھیرا رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کل اگر یہی روس پاکستان میں داخل اندازی شروع کرے گا تو ان کا مدیہ کیا ہو گا؟

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اسلام اور اس کے مقاصد سے حقوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجیے کہ اس کے لحاظ سے تو لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دور لیے جا رہی ہے، لیکن محض تومی مفاد کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو مجھے وہ نضا کہیں نظر نہیں آتی جس کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ بڑی ہی کوئی سازگار نضا ہے۔ یہ مختلف عناصر آج کانگریس کے مقابلہ میں متحد و متفق ہو سکتے ہیں، لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ کل یہ سب مل کر کوئی ایک تعمیری اسکیم بنا سکیں اور اسے ٹھیک ٹھیک چلا لے جائیں۔

(ترجمان القرآن - فروری ۱۹۴۶ء)

اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لیگ کا دستور اساسی کمیونسٹوں کے داخلہ میں کسی طرح مانع نہیں ہے۔ چونکہ یہ مسلم لیگ بلا اسلام بنائی گئی ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے اسلام پر اعتقاد اور اس کی پیروی شرط نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کا نام مسلمانوں کا سا ہو اس میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ خدا اور آخرت اور رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ (قدیم)

تقسیم سے قبل

ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۹ اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کے

اجلاس منعقدہ مدراس میں کی گئی تھی۔)

ذیقعد اور دوستو! اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کے باشندوں کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اُسی طرح ہماری اس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کن ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس موقع پر ہم پوری ہوش مندی کے ساتھ اپنے اُس مقصد کو جس کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اور اُن حالات کو جن میں ہمیں کام کرنا ہے، اور اُس رخ کو جس کی طرف یہ حالات چاہے ہیں اور جن میں سے ہمیں اپنا راستہ نکالنا ہوگا، اچھی طرح سمجھ لیں، اور ہمارا ہر کارکن پوری بصیرت کے ساتھ یہ جان لے کہ موجودہ اور آئندہ حالات میں اُسے کس حکمت عملی پر کاربند ہونا ہے۔

ہماری اس تحریک کا مقصد، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، صاف اور واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اُس صحیح طریق زندگی کو جس کا نام اسلام ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر عملاً قائم کریں، اپنے قول و عمل سے اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کریں، دنیا کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ اُسی طریق زندگی میں اس کے لیے فلاح اور سعادت ہے، اور موجودہ باطل نظاموں کی جگہ وہ نظام حق برپا کرنے کی جدوجہد کریں جو سراسر اُس طریق زندگی پر مبنی ہو۔ اس

اے بے پہنچاقتیں۔

ہندوستان میں اس وقت جو حالات رونما ہیں وہ بظاہر سماجی دعوت کے لحاظ سے نہایت مایوس کن ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ سب لوگوں پر ان کا دل شکن اثر پڑ رہا ہے۔ ملک کی مختلف قومیں قومی خود غرضی میں بڑی طرح مبتلا ہیں اور قوم پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان سے وہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں جنہیں اگر جانوروں سے بھی منسوب کیا جائے تو وہ اپنی توہین سمجھیں۔ قومی کشمکش نے جنگ کی اور جنگ نے وحشت و درندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پہلے تو بات یہیں تک تھی کہ ہر قوم ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے دعوے اور جواب دعوے پیش کر رہی تھی اور اس پر تلخ کلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر اب نوبت یہ آگئی ہے کہ یہ مختلف قومیں ایک دوسرے کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کا کام ایسے ایسے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سپرد کر دیا ہے جو انہیں ہر روز خود غرضانہ قوم پرستی کی شراب، نفرت و عداوت کا ذہر ملا کر پلاتے ہیں اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی قومی خواہشات کی وکالت میں انصاف اور اخلاق کی ساری حدود کو پھاندتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی تصورات کے لیے ان کے دلوں میں اب فی الواقع کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمام اخلاقی معیارات قومیت کے تابع ہو گئے ہیں۔ جو کچھ قومی مفاد اور قومی خواہشات کی مطابقت سے وہی سب سے بڑا اخلاق ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو، خیانت ہو، ظلم ہو، سنگدلی اور بے رحمی ہو، یا اور کوئی ایسی چیز جو دنیا کے معروف اخلاقیات میں ہمیشہ سے بدی سمجھی جاتی رہی ہے۔ بخلاف اس کے سچائی، انصاف، دیانت، رحم، شرافت، انسانیت سب گناہ قرار پا چکے ہیں اگر وہ قومی مفاد کے خلاف پڑتے ہوں یا قومی خواہشات کے حصول میں مانع ہوں۔

ان حالات میں کسی ایسی دعوت کے لیے کام کرنا سمجھنا مشکل ہے جو قومیتوں کو نظر انداز کر کے انسانیت کو خطاب کرتی ہو، جو قومی خواہشات کو چھوڑ کر خالص اصول حق کی طرف بلائی ہو، اور قومی خود غرضیوں کو توڑ کر عالمگیر انصاف قائم کرنا چاہتی ہو۔ جنون قومیت کے اس دور میں ایسی دعوت کی آواز سننے کے لیے ہندو تیار ہیں نہ مسلمان۔ مسلمان کہتے

ہیں کہ تم ہماری قوم کے افراد ہو، تمہارا فرض تھا کہ قوم کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر قومی لڑائی لڑتے، یہ تم نے الگ جتھابنا کر دین و اخلاق اور اصول حق کی رٹ کیا لگانی شروع کر دی؟ تمہاری اس صداقت سے بے ہنگام سے قوم کی طاقت منتشر ہوتی ہے اور قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہذا ہم تمہیں قوم کا دشمن سمجھتے ہیں خواہ تمہاری دعوت اُسی اسلام کی طرف ہو جس کا نام لے کر ہم یہ قومی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے پاس جلیتے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی بات دل کو تو ضرور لگتی ہے، مگر اس چھاچھ کو ذرا پھینک کر پتہ چاہیے، کیونکہ یہ ہیں تو اُسی قوم کے افراد جس سے ہماری لڑائی ہے، کیا خبر کہ یہ اصول دعوت بھی مسلمان قومیت ہی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسری تدبیر ہو۔

لیکن یہ حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوں، بہر حال مستقل نہیں ہیں بلکہ عنقریب بدل جانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ صبر اور عسکری اخلاق سے اپنا کام کیے جائیں۔ اُبھرنے والوں کے ساتھ نہ الجھیں، نادان لوگوں کی مخالفتوں پر برا فروختہ نہ ہوں، جن لوگوں میں درست اور دشمن تک کی تیز باقی نہیں رہی ہے اور جو لوگ جوش جنوں میں اب خود اپنے بھلے اور بُرے تک کا ہوش نہیں رکھتے وہ اگر جہالت اور جاہلیت پر اُتر آئیں تو آپ شریف آدمیوں کی طرح ان کے مقابلے سے ہٹ جائیں اور ان کی نیابتوں کو خاموشی سے سہہ لیں۔ اس کے ساتھ آپ کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ معقول طریقہ سے اپنی دعوت مسلم اور غیر مسلم مومنانہی کے اُن سب لوگوں تک پہنچائیں جو معقول بات کو سننے اور اس پر کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طریقہ پر اگر آپ نے عمل کیا تو ایک طرف آپ کی اخلاقی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا اور دوسری طرف وہ ذہنی فضا ایک حد تک تیار ہو جائے گی جو اُنے والے حالات میں موثر کام کے لیے ضروری ہے۔

جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ یہ بڑا تغیر اُس نقشے کو بالکل بدل دے گا جس پر اس وقت تک

حالات چلتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور ان کی نوعیتیں بالکل بدل جاتیں گی۔ ان کو بالکل ایک دوسری ہی صورت حال سے سابقہ پیش آئے گا۔ جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویہ اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو جائے گا۔ بدلے ہوئے حالات میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں اس نے انہیں کہاں لاکھڑا کیا ہے اور اب اس نئے دور زندگی میں ان کے لیے راہ عمل کیا ہے۔ آج کے ہنر اور جھے ہوتے عقیدے اس وقت پھل ہو جاتیں گے۔ آج کے خیالات اور تصورات کے لیے اس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پہچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھ جائیں گی۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مر جاتیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں۔

اُنے واسے اس دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ نظام جماعت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری انتظامات خود کر سکے۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر تو میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا، کیونکہ اس کے لیے موزوں مقام شمال مغربی علاقہ کا اجتماع ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندو ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آئے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملہ کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس مسلم قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ

انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوتی ہے جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا اور جنہیں خود مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کر کے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی، انہیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان اصولوں پر بنے ہوئے نظامِ حکومت میں جو کچھ ملتا ہے اکثریت کو ملتا ہے، اقلیت کو اگر ملتا بھی ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حراست اور برتر مقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی، مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانستے بوجھتے آنکھیں بند کر لیں اور اس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظامِ حکومت کے لیے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پر راضی ہو گئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی طرح اور خوریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت "کامیابی" کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے، اور جس چیز کے لیے اقلیت کے صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے، یعنی اکثریت کی آزاد و خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اُس اکثریت کے جس سے وہ ابھی لڑ رہے تھے۔

جو اسٹیٹ اب مسلم اقلیت کے علاقوں میں بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ ہوگا۔ قومیت، جمہوریت کے جن نظریات کو مسلمان اور ہندو یکساں تسلیم کر کے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں ان کی بنیاد پر کوئی قومی اسٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری ایسی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کرتا جو حکمران قومیت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ یہ پسینہ صرف اُسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک ملک میں عملاً اقتدار ایک بیرونی قوم کا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اس کے محکوم تھے۔ صرف اُسی وقت یہ ممکن تھا کہ اقلیت بھی اکثریت کی طرح

اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کرے اور کم و بیش اپنے کچھ مستقل حقوق منوائے۔ مگر جب جمہوری اصول پر اہل ملک کی آزاد حکومت بن جائے گی تو ہندو ہندوستان اکثریت کا قومی اسٹیٹ بن کر رہے گا اور اس میں کسی اقلیت کی جدا گانہ قومیت اور مخصوص قومی مطالبات کے لیے گنجائش نہ ہوگی۔ قومی اسٹیٹ ایسی کسی قومیت کو تسلیم کرے گا اس کے مطالبے کبھی پورے نہیں کیا کرتا، بلکہ وہ پہلے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے تحلیل کر کے اپنے اندر محکم کرے، پھر اگر وہ اتنی سخت جان نکلتی ہے کہ محکم نہ ہو سکے تو اسے دبا دینا چاہتا ہے تاکہ جدا گانہ قومی وجود اور اس کی بنا پر مستقل قومی مطالبوں کی آواز بلند ہونے ہی نہ پاسے، اور بالآخر اگر وہ دباؤ کے نیچے بھی چپنے ہی چلی جائے تو پھر قومی اسٹیٹ اسے باقاعدہ فنا کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہندوؤں کے قومی اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کو پیش آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بھی عملاً یہی تین راستے پیش کیے جاتے گئے۔

یا تو اپنی جدا گانہ قومیت کے دعوے اور اس کی بنا پر مستقل حقوق کے مطالبے سے دستبردار ہو کر اسٹیٹ کی قومیت میں جذبہ ہو جائے۔

یا اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو اسے ہر قسم کے حقوق سے محروم کر کے شہرہوں اور اچھوتوں کی سی حالت میں رکھا جائے۔

یا اس پر استیصال کا پہم عمل جاری کر دیا جائے یہاں تک کہ قومی اسٹیٹ کے حدود میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

یہ لازمی نتیجہ ہے مغربی فلسفہ کے ایک جمہوری نظام میں قومیت کی اساس پر اپنی سیاسی پالیسی کی عمارت اٹھانے کا۔ بصیرت کی آنکھیں اس نتیجہ کو اسی وقت دیکھ سکتی تھیں جب یہ پالیسی اختیار کی جا رہی تھی اور یہ نتیجہ ابھی بہت دور تھا۔ مگر اس وقت دیکھنے سے انکار کیا گیا اور دکھانے کی کوشش کرنے والوں کو دشمن سمجھا گیا۔ اب یہ نتیجہ بالکل سامنے آ گیا ہے اور افسوس کہ اسے دیکھنا ہی نہیں بھگتنا بھی پڑے گا۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے جو گروہ اس وقت ہمیش پیش ہیں ان میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمانوں کا گروہ ہے جو آنے والے دور میں وہی پارٹ اورا کے گاجوانگریزی دور میں خان بہادر

طبقہ ادا کر چکا ہے۔ یہ گروہ مسلمانوں کو دعوت دیگا کہ پہلی صورت کو برضا و رغبت قبول کر لیں، یعنی اپنی قومی انفرادیت کے دعوے اور مخصوص حقوق کے مطالبے سے دست بردار ہو کر سیدھی طرح اسٹیٹ کی قومیت میں مدغم ہو جائیں۔ اس گروہ کی بات اب تک تو نہیں چلی ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اگے بہت کچھ چلنے لگے گی، کیونکہ آئندہ یہی لوگ سرکار میں ہوں گے، انہی کی مدد سے نوکریاں اور ٹھیکے اور تعلیم گاہوں کے گرانٹ وغیرہ ملا کریں گے اور یہی حکمران قوم اور محکوم قوم کے درمیان واسطہ و وسیلہ بنیں گے۔ ان کی کوششیں مسلمانوں کی ایک مقتدر تعداد کو اس حد تک گرا دینے میں کامیاب ہو جائیں گی کہ وہ خود مہاشے اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں شرمیلیاں بنیں اور لباس، زبان، معاشرت، خیالات، ہر چیز میں حکمران قوم سے اس درجہ ہم رنگ ہو جائیں کہ ”تاکس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری“ جس قوم کی ایک بڑی تعداد اس سے پہلے مسٹر آفیس بن چکی ہے آخر اس کے لیے اب یہ نیا تغیر ناممکن کیوں ہونے لگا؟ خصوصاً جب کہ آئندہ روٹی اور خوش حالی اور ترقی کا انحصار اسی پر ہوگا۔ لیکن مجھے اُمید نہیں کہ مسلمان من حیث القوم اس طرح سپر ڈال دینے پر راضی ہو جائیں گے۔ قومی حیثیت سے ان کی کوشش یہی ہوگی کہ اس جذبہ و انجذاب کی مزاحمت کریں۔

مزاحمت کے لیے وہ ابتداءً اُسی گروہ کی طرف رجوع کریں گے جو اس وقت سیاسی میدان میں ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مگر تجسس بہت جلدی مسلمانوں کو بتا دے گا کہ اب اس گروہ کی سیاست پر چل کر وہ سیدھے تباہی کے گڑھے کی طرف جائیں گے۔ اکثریت کے قومی جمہوری اسٹیٹ میں رہ کر اگر اقلیت قومی جنگ لڑے گی تو ہر طرف سے پسی اور کھلی جائے گی، زندگی کے ہر شعبے سے نکالی جائے گی، ہر قسم کے حقوق سے محروم کی جائے گی، اچھوتوں سے بھی بدتر حالت میں گرا دی جائے گی اور پھر بھی اگر اس کی آواز اٹھتی رہی تو اسے اس طرح مٹایا جائے گا کہ اس پر نہ زمین روئے گی نہ آسمان۔

کہا جاتا ہے کہ اقلیت کے مسلمانوں کو اس انجام سے بچانے کے تین ذریعے ہیں: ایک یہ کہ پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے سودا کرے گی، یعنی وہ کہے گی کہ پاکستان کی ہندو اقلیت سے ہم وہی سلوک کریں گے جو تم ہندوستان کی

قوم کتنے دن جی سکتی ہے۔ اول تو اقوام متحدہ کے نظام سے مُرافعہ کسی ایسے ہی معاملے میں کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی بہت بڑی اور نمایاں ظالمانہ کارروائی کی گئی ہو۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات خواہ مجموعی طور پر حل کر لیتا ہی بڑا ظلم بن جائے، بہر حال اس نظام میں قابلِ مرافعہ قرار نہیں پاسکتے۔ نہ اُن بظاہر معصوم پالیسیوں کو وہاں زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے جو مغربی معیار کے لحاظ سے بالکل برحق ہوتی ہیں مگر ہمارے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی حیات دینی و ملی کو بالکل ختم کر دینے والی ہیں۔ پھر اس نظام نے اب تک تو یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ بالکل بے لاگ انصاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ارکان صرف یہی نہیں دیکھتے کہ معاملہ بھلتے خود کیس ہے اور اُس میں انصاف کا تقاضا کیا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت جس حکومت کے خلاف کی گئی ہے اس سے ہماری اپنی حکومتوں کے تعلقات کیسے ہیں اور آیا اسے مطلع کرنا ہماری حکومت کی مصالحت کے مطابق ہے یا خلاف۔ اس لحاظ سے کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظامِ اقوام متحدہ کے اندر ہندوستان اور پاکستان کی اِضافی (Relative) پوزیشن کیا ہوگی اور کس کی بات وہاں زیادہ وزن دار ہوگی۔

تیسرا درجہ ہجرت کا ابد تبادُلہ آبادی کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں۔ اور تبادُلہ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کر لیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابلِ عمل ہے مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھلتے پینے لوگ یا بہت برداشتہ خاطر افراد و خاندان یا کچھ من چلے قسمت آزاد لوگ ہی حمل کر سکیں گے، مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی اور اس کا کسی بڑے پیمانے پر خود مہاجریت کرنا ممکن نہ ہوگا، اِلا یہ کہ کسی وقت خدا نخواستہ وہ حالات پیش آجائیں جو بہار وغیرہ میں پیش آئے ہیں۔ وہی دوسری صورت، تو مجھے امید نہیں کہ آئندہ پچاس سال تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں اور ڈھائی تین کروڑ غیر مسلموں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر منتقل کر دینا انتظام کر سکیں گی، خواہ وہ دل سے ایسا کرنا

چاہیں۔ تاہم اگر کوئی اس اُمید پر جینا چاہتا ہو تو ضرور چھیے۔

یہ ہے اُن مذاہن کی حقیقت جن کی بنا پر اُمید کی جارہی ہے کہ قوم پرستانہ سیاست جس طرح انگریزی اقتدار کے دھرم میں چلتی رہی ہے، اسی طرح ہندوستان کی قومی حکومت بن جانے کے بعد بھی چل سکے گی۔ آج مسلمان اپنی جہالت اور کم نگاہی کی وجہ سے ان حقائق کو نہیں سمجھ رہے ہیں، مگر وہ وقت قریب ہے جب یہ حقائق خدا اپنے آپ کو ان کی سمجھ میں اُتار دیں گے اور اس وقت لا محالہ ان کو تین راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

ایک یہ کہ "نیشنلسٹ" مسلمانوں کی پالیسی قبول کر کے ہندو قومیت میں جذبہ ہونے پر تیار ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ "مسلم قوم پرستی" کی موجودہ روش پر بدستور چلتے رہیں یہاں تک کہ مسٹ جائیں۔

تیسرے یہ کہ قوم پرستی اور اس کے طور طریقوں اور اس کے دعوؤں اور مطالبوں سے تو یہ کر کے اسلام کی رہنمائی قبول کر لیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی اغراض کے لیے سعی و جہد کرنے کے بجائے اپنی تمام کوششوں کو صرف اسلام کی اصول و دعوت پر مرکوز کر دیں اور مین حیثیت المقوم اپنے اخلاق، اعمال اور اجتماعی زندگی میں اُس کی شہادت دیں جس سے دنیا یقین کر سکے کہ فی الواقع یہ وہ قوم ہے جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ محض دنیا کی اصلاح کے لیے جینے والی ہے اور درحقیقت جن اصولوں کو یہ پیش کر رہی ہے وہ انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت اعلیٰ اور رفیع اور اصیل بنادینے والے ہیں۔

یہی آخری راہ مسلمانوں کے لیے پہلے بھی راہِ نجات تھی اور اب بھی اسی میں ان کے لیے نجات ہے۔ میں کئی سال سے اُن کو اسی کی طرف بلا رہا ہوں۔ اگر یہ قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اس راہ کو اختیار کرتے، اور جس طرح پچھلے دس سال میں انہوں نے اپنی پوری قومی طاقت کو اُس راہ پر لگایا ہے اُسی طرح کہیں اس راہ پر لگایا ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوتا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ

سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے لیکن اُس وقت میری دعوت انہیں دشمن کی دعوت یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔ اب واقعات انہیں گھیر کر "ناچار مسلمان شو" کے مقام پر خود کھینچ لائے ہیں۔ اب ان کے لیے زندگی کی راہ صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ اسلام کی — اصل اور حقیقی اور مخلصانہ اسلام کی — راہ ہے۔ دوسری راہیں زندگی کی نہیں بلکہ خودکشی یا سزائے موت یا طبعی وفات کی راہیں ہیں۔

یہ وقت جس کے آنے کی میں خبر دے رہا ہوں اب بالکل قریب آگیا ہے۔ جو وہی کہ ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوگا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یا سس انگریز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے انہدام کا وقت ہوگا جو تحریک خلافت کے انہدام سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہوگا۔ تحریک خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو محمود و انتشار طاری کیا تھا وہ اگرچہ نہایت نقصان دہ تھا مگر مہلک نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت کہیں پھر طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہوگی۔ اپنے اس وقت تک کے رہنماؤں سے بایوس ہو کر کوئی صحیح رہنمائی اور کوئی شعاع امید اگر مسلمانوں نے نہ پائی تو ان پر گھبراہٹ اور طوائف الملوک کی مستط ہو جائے گی۔ کوئی نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف دوڑے گا، کوئی کمیونسٹ گروہ کی طرف لپکے گا، کوئی ہجرت کی تیاری کرے گا، کوئی بایوسی کی حالت میں یا متحذاتوں توڑ کر بیٹھ جائے گا، اور کوئی دل برداشتگی کے عالم میں، یا محض احتجاجاً بھنبھلاہٹ کی بنا پر باری ہوتی قومی جنگ کو پھر تازہ کر کے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے ہزاروں لاکھوں بے گناہ بھائیوں پر بھی تباہی کا طوفان اٹھالائے گا۔ اس نازک وقت کے لیے ابھی سے ایک ایسا منظم گروہ تیار رہنا چاہیے جو ہوش میں آنے والے مسلمانوں کے سامنے بروقت صحیح راہ عمل پیش کر سکے، ان کی مائل بانقشار قوتوں کو غلط کاریوں اور خام کاریوں سے بچا کر ایک روشن نصب العین کے گرد سمیٹ سکے، اور ان کو یاس کے بعد حقیقی کامیابیوں کی بشارت دے سکے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہی کا یہ گروہ اُس خدمت کے انجام دینے کی توفیق پائے اور اُس وقت کے آنے سے پہلے اس حرکت طاقت ور اور منظم اور مستعد ہو جائے کہ یہ خدمت

انجام دے سکے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ہندو ہندوستان کی اکثریت کے مستقبل کا بھی جائزہ لیں۔ میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک فرقہ خیز خیال دیکھتے ہیں، اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ تصورات کا کوئی نکتہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ ان کو مرعہ طور پر یہ نظر آ رہا ہے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط متحد اور منظم بلاک بنی ہوئی ہے۔ اس کے اندر کہیں کوئی خلل یا ٹکناٹ نہیں ہے جہاں سے اس کے ٹوٹنے کا امکان ہو۔ اس پر قوم پرستی کا نشہ پوری طرح مستط ہے۔ ہندوستان کا پورا نظام حکومت نہایت مستحکم طریقہ سے اس کے ہاتھ میں آچکا ہے اور جو عورتوں کی سرکاری ہے وہ منقریب پوری ہوئی جاتی ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں اسلامی انقلاب کا راستہ کدھر سے نکل آئے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مضبوط بلاک جو آپ کے سامنے نظر آ رہا ہے، اور بظاہر ٹھوس بھی محسوس ہوتا ہے، اس کی ساخت کو ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ یہ کن اجزاء سے مرکب ہے اور ان کی پیوستگی کی نوعیت کیا ہے۔

ہندوستان کے ان کروڑوں غیر مسلموں کو جس چیز نے متحد اور منظم کیا ہے وہ کوئی مستقل نظریہ حیات، کوئی مضبوط فلسفہ زندگی اور کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے کہ اس کا متزلزل ہونا اور بدل جانا مشکل ہو، بلکہ وہ محض ایک قوم پرستی کا جذبہ ہے جو ایک طرف اپنی اقتدار کے خلاف اور دوسری طرف مسلم قوم پرستی کے مقابلہ میں بھڑکایا گیا تھا۔ قوم پرستی کا نظریہ خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی مخالفت و مزاحم اور مبادی طاقت ہی کے مقابلہ میں پیدا ہوا کرتی ہے، اس کی شدت مزاحمت ہی سے بھڑکتی ہے، اور جب تک وہ طاقت مقابلہ میں موجود ہو اسی وقت تک باقی رہتی ہے۔ جو یہی کہ مزاحمت ختم ہوئی اور قوم پرستی کا مقصد حاصل ہوا یہ جذبہ آپ سے آپ دب جاتا ہے، اندرونی زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل لوگوں کی توجہات کو اپنی

طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ عناصر جو بعض قوم پرستی کے جذبہ سے باہم پیوستہ ہوتے تھے، بکھرنے لگتے ہیں۔ ہندو قوم پرستی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جن دو پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک۔۔۔۔۔ یعنی انگریزی اقتدار سے نجات پانے کا جذبہ۔۔۔۔۔ عنصر قریب گرا چاہتا ہے۔ اس کے بعد صرف دو سرا پاؤں باقی رہ جاتا ہے، یعنی مسلم قوم پرستی کے مقابلہ کا جذبہ۔ سو پاکستان کے بن جانے کے بعد اس کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ بشرطیکہ ہندو علاقے کی مسلمان اقلیت اپنے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ایسی راہ نکال لے جس سے نہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی و نزاع کے اسباب پیدا ہوں اور نہ ہندوستان کے اندر مسلم قوم پرستی کے دعووں اور مطالبوں کو دبانے کے لیے ہندو قوم پرستی کے مشتعل ہونے کا کوئی موقع باقی رہے۔ یہ حکمت اگر خدا نے مسلمانوں کو عطا کر دی تو آپ دیکھیں گے کہ نیشنلسٹ لیڈر اور قومی مذہبی عقیدتوں کے مبلغین مصنوعی خطرے اور جعلی ہوسے پیش کر کے موجودہ قوم پرستی کو زندہ اور مشتعل رکھنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ بہر حال مر کے رہے گی اور وہ مختلف و متضاد عناصر جن کی ترکیب سے یہ قوم پرست بلاک بنا ہے، بکھر کر رہیں گے۔ اس لیے کہ اس بلاک کے اندر خود اس کے اپنے عناصر ترکیبی کے درمیان جو لگتے ہیں، معاشرتی بے انصافیاں، جو معاشی جفا کاریاں، جو اغراض و مقاصد کی کشاکشیں، اور جو طبقاتی منافرتیں موجود ہیں، وہ بیرونی خطرات کے ہٹتے ہی اپنے آپ کو بزدل محسوس کرا دیں گی اور ایک کے آئندہ نظام، اختیارات کی تقسیم، حقوق کے تعین اور سماجی نظام کی تشکیل کے مسائل کا محالہ ان کو آپس میں پھاڑ دیں گے۔ اس تفرقہ کے لیے ایسے طاقت ور اور فطری اسباب موجود ہیں کہ اسے روکا ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

ہندوستان کا موجودہ سماجی نظام کچھ اس طرز پر بنا ہے کہ وہ بے شمار طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوئے اور بعض ان سے دبے ہوئے ہیں۔ ان طبقات کے درمیان پیدائشی برتری و پستی، اور اعلیٰ امتیازات کا تصور گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے اور اس کو تناسخ کے فلسفے سے اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ پست طبقات کے حق میں یہ یقین پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پستی ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ان کے کچلے کر مرنے کا لازمی

نتیجہ ہے جسے انہیں بہر حال بھگتنا ہی پڑے گا، جسے بدلنے کی ہر کوشش بے سود ہے۔ اور
اوپنٹے طبقوں کے حق میں یہ اذعان پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پیدا ہی برتری کے لیے ہوئے ہیں۔
برتری اُن کا حق اور ان کے سچے کرموں کا نتیجہ ہے اور اس کو بدلنے کی کوشش قانونِ قدرت
کے خلاف ہے۔ اس سماجی نظام میں ہر اوپر کا طبقہ نیچے والے طبقہ کے سر پر پاؤں رکھے کھڑا ہے
اور اسے روند رہا ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اُدین اور نیچ کا امتیاز ہے۔ قدم قدم پر
بے شمار بے انصافیاں ہیں۔ تمدن کے ہر گوشہ میں امتیاز کا برتاؤ ہے، خواہ کھانسنے پینے کا معاملہ
ہو یا رہن سہن کا یا شادی بیاہ کا، اور اس امتیاز میں صرف تفریق ہی کا نہیں بلکہ تحقیر اور تذلیل کا
عنصر بھی شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ اوپنٹے طبقے اس بات کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں
ہیں کہ نیچے طبقوں کے مرد اور عورتیں ان کے سے لباس اور زیور پہن لیں۔ حال ہی کی بات ہے
کہ راجپوتانہ کے گورنروں اور جاٹوں نے اس بات پر ہنگامہ بڑھا کر دیا تھا کہ چار وغیرہ نیچے طبقوں
نے — جو جنگ کی وجہ سے خوشحال ہو گئے ہیں اور کچھ باہر کی ہوا بھی کھائے ہیں —
اپنی عورتوں کو ان کی عورتوں کے سے لباس اور زیور پہنانے شروع کر دیئے ہیں۔ باوجودیکہ
یہ جاٹ اور گجر خود بھی اپنے ساتھ راجپوتوں کے ایسے ہی سلوک کی تلخی محسوس کرتے ہیں،
مگر پھر بھی انہوں نے اس بات کو اپنی حق میں قرار دیا کہ چار اٹھ کر معاشرت میں اُن کے ہم سر
بنیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر ان کی برادری نے زور لگانا شروع کیا کہ ان غریبوں کو زبردستی
اسی پستی میں پھینک دیں جس سے وہ اٹھنا چاہتے ہیں۔

معاشرتی نظام بڑی حد تک اسی سماجی نظام کی ترتیب پر قائم ہے اور اس کے قدیم ظالمانہ پہلوؤں
پر جدید سرمایہ داری کی خصوصیات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ جو طبقے قدیم اجتماعی نظریات اور مابعد
الطبیعی فلسفوں (Metaphysical Philosophies) کی مدد سے اور پر کی سرطیوں پر متمکن ہو
چکے ہیں، انہوں نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ ملک کی تمدنی زندگی میں برتری کو اپنے
لیے مخصوص کر لیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہی ملک کی دولت اور اس کے وسائل و ذرائع پر بھی
قابض ہو گئے ہیں اور نیچے کی سرطیوں پر رہنے والی عام آبادی کے لیے انہوں نے زندگی بسر
کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں چھوڑی ہے کہ وہ دولت کے ساتھ ان کی خدمت اور مزدوری

کریں۔ اس معاشی نظام میں محروم اور محنت پرست طبقوں کے ساتھ جو بے انصافیاں اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ پھر اپنے طبقوں نے خود اپنے دائرے میں بھی ظلم و نا انصافی کی بہت سی شکلیں اختیار کر رکھی ہیں جن کی بنا پر کم لوگ خوشحال اور زیادہ لوگ بد حال ہیں۔ ان کی خود خواری، ان کا مشترک خاندانی جائیداد کا طریقہ (Joint Family System) ان کا تواریث اور اولاد کا قانون (Rule of Primogeniture) اور اسی طرح کے اور بہت سے طریقے ایسے ہیں جو دولت اور اس کے ذرائع کو سمیٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور بہت سوں کو محروم اور دست نگر بنا دیتے ہیں۔ انہی طریقوں سے جن ہاتھوں میں دولت سمٹی ہے وہ اب جدید سرمایہ داری کے ڈھنگ اختیار کر کے ملک کی صنعت، تجارت اور مالیات پر مسلط ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب جو سیاسی نظام بنایا جا رہا ہے اس کی تصنیف میں کاغذ پر تو بلاشبہ جمہوریت، اجتماعی انصاف (Social Justice) مساوات اور مواقع کی یکسانی (Equality of Opportunities) کے بڑے بڑے نعیں تصورات بہت ستھری اور دلکش زبان میں رقم کیے جا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی اصل قیمت ان کے تلفظ میں نہیں، ان پر واقعی عمل درآمد میں ہے۔ عملاً جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام کی تشکیل، تعمیر اور تنفیذ کے سارے کام پر وہی طبقے عادی ہیں جو سماجی اور معاشی نظام کی اوپر والی سیڑھیوں پر نشست فرما رہے ہیں، بلکہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور تجربہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ان طبقوں کو خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر بڑا دل، وسیع ظرف اور فراخ حوصلہ نہیں دیا۔ ان کی تنگ دلی اب تک بھی ہندوستان کو بہت کچھ نقصان پہنچا چکی ہے اور آئندہ بھی اسے دیکھتے ہوئے مشکل سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ اپنی سیاسی طاقت کو واقعی انصاف متا م کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ حالات اپنے اندر اتنی قہمیاں رکھتے ہیں جنہیں ملک کی عام آبادی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اب تک قوم پرستی کے نشے نے اس احساس کو بڑی حد تک دبا دے رکھا تھا، اور لوگ اس امید پر جی رہے تھے کہ ملک کا انتظام جب ہمارے ہاتھ میں آجائے گا

تو یہ بے انصافیاں ختم ہو جاتیں گی۔ اب انتظام کے اختیارات جب فی الواقع اہل ملک کی طرف منتقل ہو جاتیں گے تو یہ سوال زیادہ دیر تک نہ چل سکے گا کہ ان اختیارات کو آئندہ کس طرح استعمال کیا جائے جس سے ملک میں حقیقی انصاف قائم ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کی باتیں اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وہ ہندو کلچر کی سابق روایات کے ساتھ مغربی یورپ اور امریکہ کے طریق زندگی اور کچھ سوشلزم کا جوڑ لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ اگر صحیح ہے تو اس طرح سے وہ ایک ناقصی جمہوریت، ایک ظاہری مساوات اور ایک نظر فریب بدل قائم کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو جاتیں گے، مگر اس کی تہہ میں بدستور وہی بے انصافیاں، وہی ناہمواریاں اور وہی تفریقیں برقرار رہیں گی جو اس وقت پائی جاتی ہیں، کیونکہ تفریق و امتیاز ہندو کلچر کی رگ رگ میں پیوست ہے جس کے ہونے کسی حقیقی جمہوریت کا قیام غیر ممکن ہے، اور اس کے ساتھ مغربی نظریات کا جوڑ لگنے سے اس کے سوا کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی کہ اونچے طبقوں کی بدترسی و سرمایہ داری کو الیکشنوں اور دونوں کے ذریعہ سے سد جواز مل جائے۔ اسی لیے یہ امر قریب قریب یقینی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بہت جلدی ہندوستان کی عام آبادی کو بایوس کر دیں گے۔ ان کے ہاتھوں انصاف قائم نہ ہو سکے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرنے پائے گی کہ ہندوستانی عوام، کسان، مزدور اور خود اونچے طبقہ کے محروم لوگ کسی دوسرے منصفانہ نظام کی طلب میں بے چین ہونے لگیں گے۔

اشتراکی گروہ اسی صورت حال سے تائدہ اٹھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جو یہی کہ موجودہ قوم پرستی اپنے مدعا کو پہنچنے کے بعد مضمحل ہوتی، وہ اسی طبقاتی عقل اور اسی تصادم اغراض کے شکاروں میں سے اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کرے گا اور عام باشندوں کو انصاف کی امیدیں دلا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہے گا۔ مگر اس گروہ کے پاس ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو خود ظلم سے، بے انصافی سے، کشت و خون اور فساد سے اور بالآخر جاری دہماری سے پاک ہو۔ وہ ہندوستان کو موجودہ فرقہ وارانہ منافرت اور نزاع کی جگہ طبقہ وارانہ منافرت اور نزاع کا تحفہ دے گا۔ اب تک جہاں ہندو اور مسلمان کے جھگڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے سر بھاڑتے اور گھر جلاتے رہے ہیں وہاں اب

روٹی کے جھگڑے کی بنا پر وہی لوگ کشت و خون کرنے لگیں گے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے
 خلاف اسی طرح نفرت اور غصے سے بھڑک اٹھے گا جس طرح آج ایک فرقہ دوسرے فرقے
 کیخلاف بھڑکا ہوا ہے۔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی جگہ طبقاتی مفاد کی پرستاری سے لے گی اور
 انصاف کے حقیقی جذبہ سے دل جس طرح آج قومی جنگ کے زمانے میں خالی ہیں اسی طرح اُس
 وقت طبقاتی جنگ کے زمانے میں بھی خالی ہوں گے۔ برسرِ اقتدار طبقے محروم طبقوں کو محروم رکھنے
 کے لیے لڑیں گے، اور محروم طبقے ان کی جگہ لے کر اٹھائیں محروم کر دینے کے لیے سر دھڑکی
 بازی لگائیں گے۔ اس طرح ہندوستان ایک مدت تک امن کی صورت کو ترستا رہے گا، اور
 آخر کار اگر خدا نخواستہ اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا تو مزید ایک طویل مدت تک یہاں روس
 کی طرح اُسٹپے طبقوں کو ان کی زمینوں، جائیدادوں اور کارخانوں سے بے دخل کرنے کے لیے
 سخت کشت و خون اور ظلم و جور کا بازار گرم رہے گا۔ پھر اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد
 ویسی ہی ڈکٹیٹر شپ یہاں بھی قائم ہوگی جیسی روس میں ہے۔ اسی طرح ملک کی پوری آبادی
 کو ایک جاہلانہ اور ہمہ گیر (Totalitarian) اقتدار کے شکنجے میں کس دیا جائے گا، اُسی طرح
 لوگ زبان اور ظلم اور خیال کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اُسی طرح تمام لوگوں کا ذوق چند
 لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے گا، اور اسی طرح ہندوگانِ خدا کو اتنی آزادی بھی حاصل نہ رہے
 گی کہ اس نظام کی سختیوں سے دل برداشتہ ہوں تو کچھ احتجاج پکار کر لیں، یا اس حالت کو
 بدلنے کے لیے کوئی سیاسی تنظیم اور اجتماعی کوشش کر سکیں۔ — اللہ ان سب
 سے بڑھ کر اس اشتراکی انقلاب سے جو نقصان ہندوستان کو پہنچے گا وہ یہ ہے کہ پچھلی صدیوں
 کے انحطاط کے باوجود جو تھوڑی بہت روحانی اور اخلاقی قدیں ہندوستان کی تہذیب
 میں باقی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی اور یہ ملک ہر امر ایک باقیہ پرست ملک بن کر رہ جائیگا۔
 اس انجام سے اگر کوئی چیز ہندوستان کو بچا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ کوئی گروہ ایک
 ایسے نظام فکر و عمل کو لے کر اُٹھے جس میں اعلیٰ درجہ کی اور حقیقی روحانی و اخلاقی قدیں بھی ہوں،
 سچائی اور بے لاگ اجتماعی انصاف بھی ہو، اصلی جمہوریت۔ — محض سیاسی ہی نہیں
 بلکہ تمدنی و معاشرتی جمہوریت (Social Democracy)۔ — بھی ہو، اور تمام

باشندگان ملک کے لیے بلا امتیاز طبقہ و نسل انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ترقی کے یکساں مواقع بھی ہوں۔ جو ایک یا چند طبقوں کے مفاد کو نہیں بلکہ سب انسانوں کے مفاد کو یکساں ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھے، کسی کا حمایتی اور کسی کا دشمن نہ ہو، طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بجائے ایک معنی برانصاف نظام زندگی پر انہیں متوجہ کرے، محروم طبقوں کو وہی کچھ دلائے جو ان کا فطری حق ہے اور اپنے طبقوں سے صرف وہی کچھ لے جو ان کے پاس ان کے فطری حقوق سے زیادہ ہے۔ ایسے ایک نظام کو اگر ملک کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہوں جن کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جاسکے، جو خود کسی قسم کی توہمی یا طبقاتی یا ذاتی خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں، جن کی اپنی زندگیاں اس بات پر گواہ ہوں کہ درحقیقت انہی سے انصاف کی اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے، اور جن میں دیانت اور انتظام دنیا کی صلاحیت دونوں جمع ہوں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس نظام کے مقابلہ میں اشتراکی انقلاب کے راستے کو ترجیح دیں۔ اشتراکی انقلاب تو ایک آپریشن ہے جو مرض کے ساتھ تندرستی کے بھی ایک بڑے حصے کا استیصال کر دیتا ہے، اور انسان بڑے صرط ایسی جمہوری کی حاملت ہی میں گوارا کیا کرتا ہے جب وہ اسے مرض کی اصلاح ہو لے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک کے لوگوں نے اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کیا ہے اسی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے ظالمانہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کوئی ایسا تیسرا راستہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ان دونوں کی خرابیوں سے بچ کر انصاف پالینے کی اُمید کر سکتے۔ اگر اس قسم کا تیسرا راستہ پیش کر دیا جائے — جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے — تو نہ ہندوستان کے لوگ ایسے پاگل ہیں اور نہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی آبادی، ہی کو اس قدر دیوانہ فریض کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ وہ ایک کارگروہ کو آزمائش کے بجائے خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کریں۔

سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان یہ تیسرا راستہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پیش کر سکتے ہیں اور اس تیسرے راستے کا نام اسلام ہی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مستقبل کے ہندوستان میں اشتراکیت کے بالمقابل اسلام کے لیے کامیابی کے کم از کم ۶۰ فی صدی امکانات

ہیں یہ مسلمانوں کی انتہائی بد قسمتی اور سخت تلافی ہوگی کہ ان کے پاس اسلام جیسا ایک کامل اور صحیح نظام موجود ہو اور پھر وہ اسے لے کر اٹھنے کے بجائے پورا میدان اشتراکیت کے لیے خالی پھوڑ دیں۔

اب میں آپ کو مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا راستہ ہمارے کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔

(۱) سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنی قومی اغراض اور مطالبوں کے لیے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور اعمقانہ خودکشی ہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرز عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دھڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لیے کشمکش، اور یہ دوسرے قومی حقوق اور مطالبوں کے لیے چیخ پکار آئندہ دور میں حاصل ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ حاصل اس لیے کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت آ رہی ہے وہ غلط انتخابات اور ملازمتوں میں صرف قابلیت کے لحاظ کا اصول مقرر کر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ان کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جاسکتا۔ نقصان دہ اس لیے کہ ان حقوق کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی، اور اگر وہ اپنی شکایات کو رفع کرانے کے لیے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بھی الاقوامی پیچیدگی اور کشمکش کا سبب بن جائے گا جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائے گی۔ لہذا اب ہمیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں ایسی رائے عام تیار کرنی چاہیے کہ وہ ہمیشہ ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رخی اختیار کر لیں اور ہندو قوم پرستی کو اپنے طرز عمل سے براعینان دلا دیں کہ میدان میں کوئی دوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اس غیر معمولی تعصب کو ختم کر دینے کا جو اس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف

پیدا ہو گیا ہے، اور اسی طریقہ سے غیر مسلموں کے اس اندیشے کو بھی دُور کیا جاسکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقہ کے مسلمان ایک اور پاکستان مانگنے کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔

(۲) دوسرا اہم کام ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلانے، ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کر دیں، اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کر لیں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی میں بہتر محسوس ہونے لگے اور ان میں سے جو لوگ بھی اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں، خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں، ان کو بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے اندر لیا جاسکے۔ یہ کام برسوں کی انتھک اور لگاتار محنت چاہتا ہے، مگر جب تک ہم مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصہ کو علمی و عملی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے اسلام کا صحیح فائدہ نہ بنالیں، ہمارا یہ اُمید کرنا محض ایک بوالغضولی ہے کہ ہندوستان کی عوام غیر مسلم آبادی کی راستے کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جاسکے گا۔ غیر مسلموں کے سامنے آپ کا فائدہ پہچاننا تقریر میں اسلام کو کیسے ہی دلپذیر یا نواز سے پیش کریں، بہر حال وہ ان کو اپیل نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام کے فائدوں کا جو تجربہ انہیں رات دن کی زندگی میں ہوتا ہے وہ آپ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر اگر ان میں کوئی ایسا حق پسند نکل بھی آئے کہ مسلمانوں کے بجائے اسلام کو دیکھ کر اسے قبول کر لے، تو موجودہ مسلم سوسائٹی میں اس کا کھینا مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ یہاں ابھی تک قدیم ہندو انا جاہلیت کے موروثی تعصبات، اُپرے نیچے کے امتیازات، ذات برادری کے تفرقات، اسلام میں آجانے کے باوجود جوں کے توں محفوظ ہیں اور اس بنا پر ایک نو مسلم کو پھر انہی معاشرتی خرابیوں سے سابقہ پیش آتا ہے جنہیں چھوڑ کر وہ ہندو سوسائٹی سے نکلا تھا۔ لہذا مسلمانوں کی۔۔۔ اگر سب کی نہیں تو کم از کم ان کے ایک معتد بہ حصہ کی۔۔۔ اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے بغیر دعوتِ اسلامی کا قدم اُگے نہیں بڑھ سکتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم محض نو مسلموں کی ایک الگ سوسائٹی بنا سکیں۔ اس اصلاح میں اگر ہم کسی حد تک بھی کامیاب ہو جائیں اور

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اسلام سے عام واقفیت بھی پیدا کر دیں اور ان کے اندر یہ جذبہ بھی ابھار دیں کہ رات دن کی زندگی میں ان کو ہر جگہ غیر مسلموں سے جو سابقہ پیش آتا ہے اس میں وہ حسب موقع ان کے سامنے اسلام کو پیش کرتے رہیں، تو دعوت کی رفتار اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی دوسری تحریک اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ اس تعداد کا بیسواں حصہ بھی اگر اسلام کو جانتا ہو اور اس کی تبلیغ شروع کر دے، تو اسلام کے مبلغوں کی تعداد ۲۵،۲۰ لاکھ کے لگ بھگ ہوگی۔ کیا کوئی دوسری تحریک ایسی موجود ہے جس کے پاس اتنے مبلغ ہوں؟ پھر مسلمان ہندوستان کی آبادی میں کچڑی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ بٹے بٹے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ ہر وقت انہیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے اور اپنے برتاؤ کا اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کسی دوسری تحریک کو یہ مواقع حاصل ہیں؟ پھر دوسری کسی تحریک کی اپنی کوئی مستقل سوسائٹی اور اپنا کوئی تمدنی نظام نہیں ہے۔ ان کے دامن میں پناہ لے کر ہندوستان کے بسنے والے اور دبے ہوئے طبقے کو اپنے پیٹ کے مطالبے تو پورے کر سکتے ہیں مگر اپنی معاشرتی زندگی کی مشکلات اور غریبیاں رفع نہیں کر سکتے۔ بسکھٹ اس کے مسلمان اپنی ایک مستقل سوسائٹی رکھتے ہیں جو اگر ہمارے نصب العین کے مطابق کچھ بھی اصلاح یافتہ ہو جائے تو تمام ان لوگوں کے لیے پوری پناہ گاہ بن سکتی ہے جنہیں معاشرتی زندگی میں پسٹ بنا کر رکھ دیا گیا ہے، یا جن کو جاہلی نظام تمدن و معاشرت کی دوسری غریبوں نے پریشان کر دیا ہے۔

(۳) تیسرا مزدی کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کے مسلمانوں کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی اس دعوت کے لیے فراہم کر دیں اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ان مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے جن پر اس نے اب تک نظر جمایا رکھی تھی۔ اس ناکامی کا شعور حاصل ہوتے ہی اس پر یاس طاری ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس موقع پر اگر ان کے سامنے ایک روشن نصب العین امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے تو وہ ان کے ایک بڑے حصے کی توجہات اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اس طرح جیسے جیسے ہماری

دعوت کو یہ طاقت حاصل ہوتی جلتے ہم چاہتے ہیں کہ اُسے اُن تقیہ خیز کاموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی انقلاب کو قریب تر لے سکیں۔ مثلاً ہم مسلمانوں کی اخبار نویسی کے موجودہ رجحانات کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہل قلم اب انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں حقوق کی پیچ پکار، ملازمتوں کے فی صدی تناسب پر شور و غل اور محکموں میں ہندو گردی پر دوا دینا کرنے کے بجائے رائج الوقت نظام پر اصولی تنقید کریں، اس کی خامیوں کا ایک ایک پہلو نمایاں کر کے پبلک کو دکھائیں اور اس سے بہتر ایک نظام زندگی پیش کر کے راستے عام کو اس کے حق میں ہموار کریں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ادیب اور باب نشاط کا پیشہ چھوڑ کر اپنی ادبی قابلیتوں کو ایک اعلیٰ درجہ کا تعمیری ادب پیدا کرنے میں صرف کریں جو انسانیت کے شعور کو بیدار کرے، اور ذہنوں میں ایک صالح نظام کے لیے تڑپ پیدا کر دے۔ پھر جن لوگوں کو خدا نے زیادہ بلند درجہ کی دماغی صلاحیتیں دی ہیں ان کو ہم دنیا کی ذہنی امامت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کی مشعل ہاتھ میں لے کر علم کے ہر گوشے اور مسائل حیات کے ہر پہلو کا جائزہ لیں اور تحقیق و کاوش کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کی پوری تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دیں جس سے دیکھ کر لوگ باسانی یہ معلوم کر سکیں کہ اگر دنیا کا انتظام اُس نظام کے مطابق ہو تو اس کی تفصیلی صورت کیا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ اسی اہل دماغ طبقہ میں سے وہ لوگ بھی نکل سکتے ہیں جو لیڈر شپ کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اسلامی دعوت کو ایک عمومی تحریک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے کے لیے تیار کیا جائے۔

(۴) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کا رکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی اُن مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تفسیر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اور ٹریڈنگ کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی اتمائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری ٹریڈنگ عقل کر دیا جائے۔ جنوبی ہند میں تامل، تملنگ، کنڑی، ملایالم اور مراٹھی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگالہ اور بھارتی ہندوستان

میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور انہی میں ملک کا لٹریچر شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر و تقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بے گانہ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔ بلاشبہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایہ علم و تہذیب اسی زبان میں ہے۔ لیکن ہم اسلام کے مستقبل کو اردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی، اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی، تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا، ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر پھیلایا کریں گے اور ان سب کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں ہی کی خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے، کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درمگاہوں میں تعلیمی زبان اردو درس گاہوں سے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا، اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔

یہ چار کام ایسے ہیں جن پر ہندوستان میں اسلام کا اور خود آپ کا مستقبل منحصر ہے اس لیے آپ کو اپنے تمام مذاہن اور اپنی پوری قوت کار اور اپنی ہماری فکر ان پر مرکوز کر دینی چاہیے، کیونکہ ان ابتدائی پروگرام کو بڑی حد تک عمل میں لائے بغیر آگے کا کوئی پروگرام آپ نہیں بنا سکتے۔ اب وہ وقت ہے کہ ایک لمحہ بھی اگر آپ تساہلی میں مبتلا نہ کریں گے تو جرم کریں گے۔ جس طوفان کی میں دس سال سے خبر دیا رہا ہوں وہ آئندہ آیا ہے۔ اب اگر آپ نے اس کے تدارک کی فکر نہ کی تو یہ سب مسلمانوں کے ساتھ آپ کو جی سے ٹوہیے گا۔ جو حالات اب اس ملک میں پیش آنے والے ہیں وہ آپ کے صبر کا، آپ کے عزم کا، آپ کے استقلال کا، آپ کی حکمت و دانائی کا، اور آپ کی عملی طاقت کا سخت امتحان ہیں گے۔ آپ کے ایک طرف دجال کی جنت ہوگی جن میں داخل ہونے اور دوسری جانب پر چڑھنے کے لیے شرط لازم یہ ہوگی کہ تیز سے تیز قوت قائم رکھنے

دالے کو بھی آدمی کے اندر اسلامیت اور اسلامی غیرت کی ذرا سی بڑبڑ محسوس نہ ہو سکے، اور آپ دیکھیں
 گے کہ آپ کے گرد و پیش بہت سے مسلمان اپنی دنیوی نجات کی خاطر اس شرط کو پورا کرنے پر آمادہ
 ہو جائیں گے۔ آپ کے دوسری جانب، متھوڑے اور ذاتی کا بھنڈا بلند ہوگا اور اس کے سایہ
 میں ایک دوسری جنت شداد کا خیالی نقشہ پیش کیا جائے گا جس کے عاشقوں کو قسم دی جاتے گی
 کہ خدا پرستی اور دیانت و اخلاق سے اپنے دلوں کو خالی کر لیں۔ آپ کی آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی
 کہ دنیا کے بھوکے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک جہم غیظ اس کی طرف دوڑ رہا ہوگا۔ ان دو جھوٹی
 جنتوں کے درمیان آپ اپنے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا پائیں گے جہاں اسلام پر چنے والوں
 اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ترقی و خوشحالی تو دیکھنا زندہ رہنے کا سامان بھی مشکل
 ہی سے میسر آئے گا۔ ان کو ہر قدم پر ہمت شکن حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ ان کی غیرت
 اسلامی اور عزت نفس کو ہر وقت چوڑے لگیں گے۔ شہادتِ اسلامی کو وہ نہ صرف مٹتے دیکھیں گے
 بلکہ ان کی علانیہ اہانت ہوگی اور بعید نہیں کہ مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں ہو۔ ان حالات میں
 صرف وہی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر سکیں گے جو غیر معمولی صبر و ثبات، انتہائی
 سرگرمی، اور فائیت درجہ کی حکمت و دانشمندی سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تین خصوصیات
 اگر آپ اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو یقیناً آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ اس طوفان کا رخ
 پھیر دینے میں بہت زیادہ دیر نہ لگے گی۔

صوبہ سرحد کے لیفرنڈم میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال: ”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صوبہ سرحد میں اس سوال پر لیفرنڈم ہونا ہے کہ اس صوبہ کے لوگ تقسیم ہند کے بعد اپنے صوبے کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ؟ وہ لوگ جو جماعت اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو اس استصواب میں راستے دینی چاہیئے؟ اور کس طرف سے راستے دینی چاہیئے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس استصواب میں بھی ہماری ٹیلی اسی طرح غیر جانب دارانہ ہونی چاہیئے جیسی مجالس قانون ساز کے سابق انتخابات میں رہی ہے، ورنہ ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو یہ ووٹ آپ سے آپ اس نظام حکومت کے حق میں بھی شمار ہوگا جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے۔“

جواب ہے: استصواب راستے کا معاملہ مجالس قانون ساز کے انتخابات کے معاملے سے اصولاً مختلف ہے۔ استصواب راستے صرف اس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو، ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں راستے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قیاحت نہیں۔ لہذا جن جن علاقوں میں استصواب راستے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکان جماعت اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں راستے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں راستے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی

پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف اُن امور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکان جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مواد دید کے مطابق جو راستے چاہیں دیدیں۔ البتہ شخصی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب راستے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہند اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اُس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔

پاکستان کے حق میں ووٹ دینا لازماً اُس نظام حکومت کے حق میں ووٹ دینے کا ہم معنی نہیں ہے جو آئندہ یہاں قائم ہونے والا ہے۔ وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوتا جیسا کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تو ہم دل و جان سے اس کے حامی ہوں گے۔ اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوتا تو ہم اُسے تبدیل کر کے اسلامی اصولوں پر ڈھلنے کی جدوجہد اُسی طرح کرتے ہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔

(سہ روزہ کوثر، ۵ جولائی، ۱۹۴۷ء)

میں واضح ہے کہ لاہٹ کے ایگزیکٹو کے بارے میں کوئی سوال ہمارے پاس اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت تک مشرقی بنگال اور آسام میں جماعت اسلامی کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ (جدید)

تقسیم ہند کے حالات پر تبصرہ

پچھلے سال ہماری آنکھوں نے جو ہولناک انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام ان انقلابات کو مات کر دیا ہے جو اس سے پہلے صرف ہمارے اس ملک میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسانی جانوں کا اتلاف اس سے پہلے کہیں اس سے بھی زیادہ وسیع رقبوں میں ہوتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ بڑی آبادیوں کو ان کے آبائی وطنوں سے اکھاڑ پھینکا گیا ہو۔ مگر شاید اس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اتنے بڑے پیمانہ پر ایسی سنگ دلائندہ زندگی اور ایسی بے شرمانہ بھیسیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوتی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ تلخی اور یہ تندہی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بد معاشی کا جو مظاہرہ یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ اگر گتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تقویٰ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کہ تو بت چند گنے چنے بد معاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بد معاش ثابت کیا۔

۱۔ اس جگہ ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (مجدید)

باقاعدہ حکومتیں بد معاش بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور رئیسوں اور ذریعوں نے بد معاشی کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پردے نظم و نسق نے اپنے میسٹر پٹوں اور اپنی پولیس اور اپنی فوج کے ذریعہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے ملک ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی زوال اس اتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس لباسوں، اعلیٰ ڈگریوں اور بڑے ناموں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو ہم شرفا میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پُر امن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ واقعات نے اس سائے حسن ظن کا پردہ چاک کر دیا۔ معلوم ہوتا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریز کی سنگین کار شہ تھا۔ اس سنگین کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک لاکھوں، کروڑوں ڈاکوؤں، لیٹروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالمین سے بھرا ہوا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ جو لوگ پہلے تیس سال سے اس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس نسا و عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درد سے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ کسی انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندامیری ٹوٹا ہے، بلکہ حاصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت

لے یہ پنڈت جو اہر لال نہر دتھے جنہوں نے اس کے لیے (Birth Pangs) کے الفاظ

استعمال کیے تھے۔ (جدید)

اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کہنے، بد معاش اور سفاک ہیں، یا ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے، پہلا الزام ثابت کرنے کے لیے اُس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انہوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے پچھلے دو دن تک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتداء مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے کار خرمادماغوں اور کارکنان مقول کو دیے۔ ایک قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔ پہلی چیز کو لے کر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے ”ہندوستانی قومیت“ کا ایک مصنوعی تختہ پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لیے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لیے قومیت کی جس بیداری کے لئے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اُن مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیتوں کا شعور جاگ اٹھا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں، جن میں سے تین — یعنی ہندو قومیت، مسلم قومیت اور سکھ قومیت — تو پوری طرح بیدار ہو کر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی بہت سی صوبائی اور لسانی قومیتیں ابھی دورانِ تخلیق میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لیے برطانوی اقتدار کے خلاف جو جہد و جدوجہد ہو رہی تھی، اس کا قدم جتنا جتنا اُگے بڑھتا گیا، ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا غمور بھڑکا دیا، اور ایک کی طرف سے

دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف مانٹہ پرستانہ اخلاق کا جود میں مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا گیا اتحاد باورے گتے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا، شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذہبوں سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کیساتھ ایمان بنگلی نگلی کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پر سے یکے، بڑی بڑی ذمہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کیے، ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے کسٹرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے کیے، عالم گوبچ کا طوفان پیا کیا، اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدست کر دیا۔ پھر دونوں مخالف گروہوں کے لوگوں نے سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں ابد زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف گھلی گھلی بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اُس بے ایمانی کو اپنے نیلے نیکی اور کارِ ثواب بنا لیا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی باتے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی دو ابواب ہیں جنہوں نے بل جُل کر وہ ہولناک نتائج پیدا کیے جو ہماری آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دود میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہتا اور سربراہ کار ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برائی گھنٹہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو محنت انٹری تھے، ایسے انٹری

اس قابل نہیں ہیں کہ کرداروں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلنا تو درحقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں، ان کا یہ مقام پیشوائی کی مستند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیے۔

یہ خیال کرنا سخت حماقت ہے کہ جو کچھ ہو گا وہ اس قومی کشمکش کا آخری باب تھا اور یہ کہ اب تقسیم ملک کے بعد تاریخ ایک صحیح راستے پر چل پڑے گی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۱ اگست، ۱۹۴۷ء کی تقسیم سے یہاں جو دو مملکتیں بنی ہیں، انہوں نے قومی خود غرضی اور اخلاقی پستی کا وہ سارا زہر میراث میں پایا ہے جو قبل تقسیم کے ہندوستان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا اور ان دونوں مملکتوں کی پیدائش کا آغاز جن سخت الناک حالات میں ہوا ہے وہ ان کی آئندہ تاریخ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نئی سیاسی سرحدوں کے دونوں جانب جو دو قومیں آباد ہیں ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف انتقام اور عداوت کے تلخ ترین جذبات سے لبریز ہیں۔ — خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تو وہ دشمنی پیدا ہو چکی ہے جو شاید اس وقت کہیں بھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان نہیں پائی جاتی۔ — مسلمان، ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو وہ چر کے لگا چکے ہیں جس کے زخم تروں بستے رہیں گے اور اب وہ کسی غیر قوم کے ماتحت بے بس نہیں ہیں بلکہ اپنی اپنی آزاد مملکتیں رکھتے ہیں۔ اگر اب بھی ان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہوش نہ آیا، اگر اب بھی ان کی لیڈر شپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی انداز اور گندی قوم پرستی پر اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے جس پر اب تک رہ چکے ہیں، تو آئندہ ان بالاختیار قوموں کی کشمکش بہت زیادہ بڑھے پیمانے پر بدرجہا زیادہ تلخ نتائج پیدا کرے گی۔ پہلے جو عالم گویچ اخباروں کے کالوں میں ہوتی تھی وہ اب بین الاقوامی چوراسے پر ہو گی۔ پہلے جو چھوٹے چھوٹے سر کے دفتروں اور منڈیوں میں برپا ہوا کرتے تھے اب وہ دو مملکتوں کے درمیان سیاسی رستم کشی اور معاشی رقابت کی شکل میں برپا ہوں گے۔ اور پھر اگر خدا نخواستہ ان دونوں قوموں کے درمیان کسی جنگ ہو گئی تو یقیناً وہ ایسی سخت انتقامی جنگ ہو گی جو اپنی وحشت و بربریت میں تاریخ انسانی کی بدترین لڑائیوں کو بھی مات کر دیگی۔

لہذا اب پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے مستقبل کی بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگر ان کی آبادیوں میں شریعت، معتول اور خداتیں انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اٹھے، اپنی اپنی قوم کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کرے، اور موجودہ قیادتوں کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلاتے جس سے ان کے تعلقات شریفانہ ہمسایگی اور منفعت تعاون پر قائم ہو سکیں۔

اب دہلی ایک نظم تقسیم کے اُس ڈرامے پر بھی ڈال لیجیے جو پچھلے سال یہاں کھیلا گیا ہے، تاکہ آپ کو ان لیڈروں کی سیاسی دانائی کا حال معلوم ہو جائے جن کی مہارت فن کا شہرہ ایک مدت سے ہم سن رہے تھے۔

اس ڈرامے کے اصل اداکار تین تھے، انگریز، کانگریس، اور مسلم لیگ۔ ان تینوں کے کام کا جائزہ لے کر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کیا ثابت کیا ہے۔

انگریزوں کے لیے دوسری جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل اور ہندوستان کی سیاسی بیداری نے جو سوال پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ آیا اس ملک پر اُردو وقت تک قابض رہنا تسلط جاری رکھا جائے یہاں تک کہ زبردستی نکالے جانے کی نوبت آجائے؟ یا وہ وقت آنے سے پہلے ہی باہمی رضامندی سے یہ ملک چھوڑ دیا جائے؟ پہلی صورت میں وہ مزید چند سال تک اس ملک پر قبضہ رکھ سکتے تھے، مگر اس عارضی فائدے کا مستقل نقصان یہ تھا کہ زبردستی نکالے جانے کے بعد انہیں اُن نام فائدوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دینا پڑتا جو ہندوستان سے اٹھاتے جاسکتے تھے۔

دوسری صورت میں برٹش ایمپائر کا بظاہر خاتمہ تھا، مگر آزاد ہندوستان سے فائدہ اٹھانے کے امکانات باقی رہتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے انگریزی قوم نے ٹھنڈے دل سے دوسری صورت کا انتخاب کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ اور نفسیات کے اس سبق سے بھی غافل نہ تھی کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہوتی ہے اس کے اندر مدتوں تک اُس قوم کے خلاف شدید تعصب بلکہ انتقام کا جذبہ بھڑکتا رہتا ہے جو اس پر جبر و تہر سے حکومت کرتی رہی ہو۔ اس لیے وہ اپنے مفاد کی خاطر یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستان

کا معاملہ ایسے طریقے سے طے کیا جائے جس سے تعصب و انتقام کے وہ سارے جذبات جو اس کے خلاف بھڑک سکتے تھے خود ہندوستانیوں کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور انگریزوں کا یا رفاہ بن کر رہے۔ اس غرض کے لیے برطانوی حکومت نے پہلے لارڈ ویول کو استعمال کرنا چاہا، مگر معلوم نہیں کہ وہ چالاک کم تھا یا شریف زیادہ، بہر حال وہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین سیاسی بد معاشی کا وہ کام انجام نہ دے سکا جو اس کی قومی حکومت اس سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار نگاہ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پوجا کر ٹھہری اور اس شخص نے اگر تقسیم ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور اتر سر کے واقعات کے بعد تقسیم ملک

لے یہ شخص کس کیرکٹر کا آدمی تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے :

لندن، ۸ نومبر۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جو ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے تھے

اور جو ملکہ برطانیہ کے شہر پر پرنس فلیپ کے بچپن میں، آج عدالت نے اس جرم پر ان کو ۶ پونڈ

جواز کی سزا دی ہے کہ انہوں نے اپنے فلام واقع کینٹ (جنوبی مشرقی انگلستان) سے دودھ

میں پانی ملا کر فروخت کیا۔ (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۴۷ء) (چاشیہ جدید)

۱۱۔ یہاں حقیقت معاملہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تاریخی وضاحت ضروری ہے۔ ۲۰ فروری، ۴۸ء کو برطانیہ کے

دیرِ غلام سٹرائیک نے دارالعوام میں جو بیان دیا تھا اس میں برطانیہ سے اہل ہند کی طرف اقتدار منتقل کرنے کے

لیے آخری تاریخ یکم جون ۴۸ء مقرر کی گئی تھی، اور کنزرویٹو پارٹی کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ اتنے بڑے فیئر کو

رو بہل لانے کے انتظامات کرنے کے لیے ۱۵ مہینے کی ہمت ناکافی ہے۔ لیکن ۲۲ مارچ، ۴۸ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن

ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو کر آیا۔ اس نے مئی کے وسط تک تقسیم ہند کا خاکہ (جس میں پنجاب و بنگال اور آسام

کی تقسیم کا تصور بھی موجود تھا) مکمل کیا اور برطانوی حکومت سے منظوری لے کر ۳ جون، ۴۸ء کو اعلان کر دیا کہ ملک کی

تقسیم اور بڑے عظیم ہند میں دو آزاد مملکتوں کی تشکیل ۵ اگست، ۴۸ء تک کر دی جائے گی۔ گویا جس کام کے

لیے ۱۵ مہینے ناکافی سمجھے جا رہے تھے اس کے لیے یکایک کسی پیشگی تیاری کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ

وہ ۲ دن میں مکمل کر دیا جائے گا۔ یہ صریحاً ایک ارادی شرارت تھی تاکہ تقسیم سخت (باقی صفحہ ۶۹۶ پر)

اور انتقالِ اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے عکس کے ایک بڑے حقے میں سخت خوریزی ہو کر رہے گی۔ اب اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا انارڈی پن تھا اور کوئی دانستہ چالاک نہ تھی جسے اس کی قوم کی رضا مندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوئے انہیں دیکھ لینے کے بعد، بجائے اس کے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے، اس پر لعنت و لعنت کی بوچھاڑ ہونی چاہیے تھی اور لاکھوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے بدلے میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضا مندی حاصل تھی۔ آج یہ اُسی چالاک لاکر شہم ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اندوہ انگیز جو کل تک تلینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا، تینوں کا مشترک دوست ہے۔ مسلمان کے لیے ہندوستان کی، اندوہ ہندو اور سکھ کے لیے پاکستان کی زمین تنگ ہے، مگر انگریز کے لیے ہر جگہ فراخی ہی فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطہ نظر سے آپ چاہے اس کو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز کی تو ہی خود غرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس پر زیادہ داد کا مستحق کون ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، یا ہندوستان کے وہ اندھے سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے؟ اس ڈراسے کی دوسری اداکار کانگریس تھی اور اس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے سوا کسی سے ادا نہیں پاسکتا۔ تقسیم ہند سے دو تہی برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ تلخی اور بد مزگی کے بڑھنے سے پہلے ہی اُس چیز کو سیدھی طرح قبول کر لیا جاتا جو ناگنہیر ہو

جکی تھی، اور بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھ کر سارے معاملات ایسے طریقے سے طے کر لیے جاتے کہ پھر مل جانے، یا کم از کم شریف ہمسایوں کی طرح رہنے کے مواقع باقی رہتے۔ دوسرا ستر یہ تھا کہ ”لے کر رہیں گے“ اور ”ہرگز نہیں گے“ کے اس جھگڑے کو انتہائی تلخی کی حد تک بڑھنے دیا جاتا اور اس ناگزیر تقسیم کو ایسے مرحلے پر پہنچ کر قبول کیا جاتا جہاں الگ ہونے والی قوموں کے درمیان دوستانہ تو درکنار شریفانہ انسانی تعلقات برقرار رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان دونوں راستوں میں سے دوسرے راستے کو انتخاب کیا اس کی وجہ اگر نادانی تھی تو بدقسمت ہے وہ قوم جو اپنی باگیں ایسے نادان لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ اور اگر اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی قوم میں اپنی ہر دلعسزدی کو کھونے کے لیے تیار نہ تھے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی پوزیشن کی خاطر ملک کو اُس راستے پر جان بوجھ کر چلایا جس میں ان کے کرداروں ہم وطنوں کی بربادی تھی۔

اس سارے کھیل میں کانگریسیں نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی ایک ایک بات کو سچا اور اپنی ایک ایک بات کو جھوٹا کر دکھایا۔ ہندوستان کی آزادی کے خلاف چرچل اور دوسرے انگریز بدترین کی سب سے زیادہ پٹل اور دیل یہ تھی کہ ہمارے بیٹے ہی ملک میں نسا و عظیم رونما ہو جاتے گا۔ کانگریسی لیڈر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ایک بات ہے جو تم اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے بناتے ہو، ذرا ذمہ داری کا بوجھ اہل ملک پہ ڈال تو دو، پھر دیکھو کہ کیسا امن اور انصاف قائم ہوتا ہے۔ اب واقعات نے کسے سچا اور کسے جھوٹا ثابت کیا؟ یہ آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

مسٹر جناح کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگریسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے۔ لیکن وزارتِ مشن (Cabinet Mission) کی آمد کے بعد سے آج تک کانگریس اور اس کے لیڈروں نے

جو کچھ کیا ہے وہ مسیحیوں کے الزام کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر سے اُس بادلے کو اتار پھینکا ہے جسے مسیحیوں نے منافقت کا لبادہ کہتے تھے۔

کانگریس کے مخالفین کہتے تھے کہ جو سوراج کانگریس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہوگا جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی آزادی نہ ہوگی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اُس تحریک آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبردارسی کا "شرف" کانگریس کو حاصل تھا۔ کانگریسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۹ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سارے اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگریس کی تحریک آزادی کو اپنے لیے تحریک برابری سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہوا وہ تو ان بدتر سے بدتر اندازوں سے بھی بدتر بہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگریس کے شدید ترین مخالف لگا سکتے تھے۔

کانگریس کا دعوے تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے بادلِ سخاوت قبول کر رہی ہے۔ لیکن تقسیم سے پہلے اند تقسیم کے وقت اند تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اس تقسیم کو دائمی اور بدی بنا دینے والا ہے۔ اگر آدمیت سے تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا، شرافت سے اس پر عملدرآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔

اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا

ہے۔

دس سال سے مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالمجید خان

کی سیاست سے متاثر تھا۔ جس طرح وہ ۳۲ سال تک محض برطانیہ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود اپنے ملک کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا، اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابل اعتماد سیرت پیدا کر لے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جوں ہی انگریز اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوتی، اس قیادت عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کر لے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چارہ ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعبیریں جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقالی اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں ہلکے تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی، اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اُٹھی۔

اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ اس نے حصول پاکستان کی جنگ میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لا محالہ ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اُسی کا خیال ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ان غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

۲۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے ہی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت ان پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بیخبری

قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس فطاری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ جن لیڈروں پر ہندوستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انہیں چھوڑ کر پاکستان اٹھ آئے اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا کہ ان کے پیچھے وہ کیا کریں۔

۴۔ جو عجیب و غریب ہدایت ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ ان سارے اصولوں کو نکل جاتیں جن پر وہ دس برس سے کانگریس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ۱۴ اگست کا سورج دو قوی نظریے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور ۱۵ اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندوستانی قومیت کا مستعد بن کر اٹھے۔

۵۔ پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچا سواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اس بڑی طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے اٹکھولا کر بات نہ کر سکتا۔

(ترجمان القرآن - جون ۱۹۴۸ء)

تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ

گزشتہ صفحات میں ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کا جو جائزہ لیا گیا تھا وہ اس کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے ملک کی عالیہ سرگزشت غنیں پر ایک نگاہ ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل کر اپنی خود غرضی، تنگ دل اور احمقانہ بے تدبیری سے اس کو کس خونخوار تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر پائی ہے — یعنی مسلم قوم — وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگریس کو برسرِ اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہِ راست ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کا پروگرام مٹن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر اچھلکے۔

اُس وقت مسلمانوں میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ خطرہ و طرہ کچھ نہیں ہے، سب تمہارا دم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈنڈا ہے، جو سیلاب اٹھتا ہے ٹھیک اٹھ رہا ہے، اطمینان کے ساتھ اس میں کود پڑو، اور دوسرے گروہ یہاں کر لے جانا چاہتا ہے پورے انشراح صدر کے ساتھ اُدھر بہہ جاؤ۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ خطرہ واقعی اور حقیقی ہے، یہ سیلاب محض آزادی وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو سامراجیت کا سیلاب ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کے معنی قومی خودکشی کے ہیں، اور اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ پہلا گروہ اگرچہ بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں اور آزمودہ کار سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھا، لیکن چونکہ وہ ایسی بات کہہ رہا تھا جو مسلمانوں کے عام احساسات کے خلاف تھی، اور پوری قوم کو ہندوستان کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کے ہاتھوں اس کے بالکل برعکس تجربات پیش کر رہے تھے، اس لیے مسلمانوں نے مجموعی طور پر اُس کو تذکرہ دیا اور جوتی و جوتی دوسرے گروہ کی آواز پر وہ بلیک کہتے چلے گئے۔

پھر دوسرے گروہ میں بھی جلدی ہی اس مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا کہ ہندو سامراج کی اس بڑھتی ہوئی رد کے مقابل میں مسلمانوں کے لیے راو عمل کیلئے ہے۔ ایک رائے یہ تھی کہ مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔ اصولاً اس لیے غلط ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ اصول اُن اسلامی اصولوں سے ٹکراتے ہیں جن پر ہم ایمان لانے کے مدّعی ہیں۔ اور عملاً یہ راہ اس بنا پر غیر مفید ہی نہیں، قطعی ہلک بھی ہے کہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصے کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں مسلمان قلیل التعداد ہیں، اور ایک جمہوری نظام میں قومی جنگ روک کر اقلیت بجز تباہی کے اور کچھ مول نہیں لے سکتی۔ اس رائے کے پیش کردہ لوگوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر تم محض ایک قوم ہوتے تو بلاشبہ تمہارے لیے یہاں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ قومی جنگ روک کر اپنے جتنے حصے کو بچا سکتے بچا لیتے اور باقی حصوں کی طرف سے پیشگی فاتحہ پڑھ لیتے۔ لیکن تم محض عام معنی میں ایک قوم نہیں ہو بلکہ ایک اصول جماعت ہو جس کے پاس اصول اسلام کا اختیار وہ زبردست اختیار ہے جو پہلے بھی دنیا کو

مسٹر کرچک ہے اور آج بھی کر سکتا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ مایوسانہ نقشہ جنگ بناؤ۔ تمہارے لیے صحیح راہ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی افواہن کے لیے لڑنے والی ایک قلیل التعداد قوم کی یہ پوزیشن چھوڑ دو جو غلطی سے تم نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مسائل زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام موجودہ وقت نظاموں سے زیادہ جامع اور مضفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ اس چیز کو لے کر اگر تم اٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے علمی و فکری حیثیت سے اصول اسلام کا تفوق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو یقیناً جانو کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازنِ قوت بدل جائے گا، ہندوستان کی سیادت تمہارے سوا پھر کسی اور کا حصہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہو، تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائے گی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لے کر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیر نگین ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ **إِنْ تَتَّبِعِ الْهَدَىٰ مَعَكَ تُتَخَفَتِ مِنَّا أَرْضُنَا**، یعنی، اگر تم اس راہِ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ رائے قومی طرزِ عمل نہ بن سکی۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سب سے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنادینا صحیح نہیں ہے، ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی اصلاح و انضباط کا کوئی سوال۔ بظاہر بات بھی بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے جس قسم کی تعلیم و تربیت مل رہی تھی، اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر بھی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقوٰۃ سے لوگوں کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس رائے کو اپنا لیا۔ اس مرکزی تختہ پر جمع ہونے کے بعد سے پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں نے من حیث القوم جو کچھ کیا ہے اسی تحریک اور اسی قیادت کے زیر اثر کیا ہے جو اس تختہ کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی۔ لہذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور ہمارے آج کے حال کا حسن و قبح لازماً اس تحریک ہی کی طرف راجع ہوگا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شامل ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، دینی و کتاب اور دین و شریعت کو ماننا ہے یا نہیں، حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور فحور و فحوی، دین داری و بے دینی کی مختلف صفات میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لیے تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی نتو سے اور امانت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد کے تحسّس کی ضرورت پیش آئی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لیے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیسا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی، اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی زیادہ ہمارے دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت، امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا۔ بعینہ اسی قسم کی تحریک ایسے ہی کارکنوں اور لیڈروں اور پیروؤں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات

تھی کہ جو قوم اپنی مداخلت کے لیے یہ تحریک لے کر اٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا۔ اس لیے اسلام کی خدمات بھی اس کے لیے حاصل کی گئیں۔ اصول یہ قرار پایا کہ ہدایت و رہنمائی تو اسلام کے بس کا رنگ نہیں ہے، اور نہ یہ کہنے کا اُسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے، البتہ یہ اُس کا فرض اور اولین فرض ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی اُمید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لیے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار لے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنم کا راستہ دکھائے، اس لیے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر مسلم قوم کا بچنا موقوف ہے، اور مسلم قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحبِ آخر رہیں گے کہاں؟ یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جانثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اُس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر اُسے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آ اور حق ملک ادا کر۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بڑے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کہیں کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحب زادے اپنے اطوار ٹھیک کر دو تو اُسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ آیا زقندر خود بشناس، تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے اٹھی اور آخر تک برہمتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا اُگے بڑھا اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لیے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لیے فریقِ جنگ بنایا گیا تھا۔ کسی ایک دن کے لیے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اُس سے استصواب کریں۔

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب دیے
 ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال
 سے دیا جائے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے، اور جو کچھ وہ اپنی
 قومی خود غسر غیور کی خاطر کرتا گیا، مسلمانوں نے اس دلیل پر اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر
 رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شاید اس سے پہلے
 وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا
 جائزہ لیجئے جو وہ قوم کو بچانے کے لیے کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت
 کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔
 ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی
 قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بٹے جن کی حیثیت ہندو ریاست کی سرحدوں
 پر قریب قریب وہی ہو جو پرنسٹن اور چیکو سلوواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر
 ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان
 کے درمیان نہ حالت امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالت جنگ میں یہ ایک دوسرے کی
 مدد کر سکیں۔

لے یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک ملک بن کر رہنا اُسی وقت تک ممکن
 ہے جب تک ہندو تقسیم کے بین الاقوامی و داخلی نامے کا احترام کریں۔ لیکن جس وقت بھی وہ اس کا احترام
 بالائے طاق رکھ دیں اور مسلمانوں کے کسی گروہ سے سازش کر کے مشرقی پاکستان میں پہلے کوئی بغاوت برپا
 کر اٹھیں اور پھر اس کی مدد کو خود پہنچ جائیں، یہ وحدت باقی نہ رہ سکے گی، کیونکہ اس صورت میں مغربی پاکستان کسی
 طرح بھی مشرقی پاکستان کو نہیں بچا سکتا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کو ہندو پاکستان کے نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر ہر شخص پہلی
 نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ (جدید)

اول روز ہی سے معلوم تھا کہ ہندو اس مطالبہ کی سخت مزاحمت کرے گا، چنانچہ وہ اُس نے کی اور ایک طرف سے مطالبے اور دوسری طرف سے مزاحمت نے چند سال کے اندر قومی جنگ کو اتنی شدید تلخی کی حد تک پہنچا دیا کہ شاید آج جرمنی اور روس، امریکہ اور جاپان، مسرب اور یہود کے درمیان بھی اس سے زیادہ تلخی نہ ہوگی۔ اس قومی جنگ میں لامحالہ مسلمان ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے تھے۔ کیونکہ ان کا پورا نصف حصہ ہمارے اپنے مطالبہ کی رُو سے ان کے مالکان تصرف میں جانے والا تھا۔ پھر چونکہ اقلیت کے مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں شریک کیا گیا تھا، بلکہ پیش پیش وہی تھے، اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ جنگ کے آخری مرحلوں میں، اور تقسیم کے بعد اُن کو بدترین مظالم کا شکار مشق بننا پڑے گا۔ یورپی، بہار، اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں کسی مکان پر پاکستان زندہ باد، لکھا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ایک وقت میں یہی فقرے بدست دشمنوں کو آتش زنی، قتل و غارت اور عصمت دری کی دعوت دیں۔

اس کے ساتھ مزید غضب یہ کہ قومی جنگ کے لیے ہم نے جو طاقت فراہم کی تھی وہ نعرے، جھنڈے، جلسے، جلوس، ریزولوشن، اخباری بیانات اور سیاسی گفت و شنید سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یہ سب ہتھیار صرف اُسی حالت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے جب کہ قسمتوں کی میزان ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خود اپنی مصلحتوں کی خاطر توازن قائم کرنے کے لیے ایک ذریعہ کے مقابلہ میں دوسرے ذریعہ کے شعور و عمل کو وزن دینا چاہے۔ ہمارے لیسٹر مذہبوں تک اس حالت میں رہتے رہتے اس کے اتنے نوگر ہو چکے تھے کہ وہ سب کچھ اس کے اندر ہی سوچ سکتے تھے۔ اس حالت کے گزر جانے کے بعد دوسری حالت میں کیا کچھ درکار ہے؟ اس کا شاید انہیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے حالات یکایک پیش آگئے تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ بالکل بے سروسامان تھے۔

پچھلے سال (۱۹۴۷ء) کے آغاز تک کسی کو بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے اندر کیا کمزوریاں لیے ہوئے ہیں، ہماری سیاست کیا نتائج اپنے اندر چھپاتے ہوئے ہے، اور قومی جنگ کس رُخ پر جاری ہے۔ شور و شغب اور ہنگامہ و جوش نے ایک ایسا قریب قوت پیدا کر دیا تھا کہ ہم اپنی تنظیم کو ایک مکمل تنظیم اور اپنی سیاست کو ایک ہرگز نہ سیاست سمجھے بیٹھے تھے، اور اُس وقت ہر

وہ شخص ہمیں اپنا دشمن نظر آ رہا تھا جو سطح کے نیچے چھپے ہوئے کمزور پہلوؤں کی طرف، یا سر پرستے ہوئے طوفانِ بلا کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کر دے۔ مگر جو نہی کہ تقسیم کا فیصلہ ہوا، یکایک وہ ساری ہی کمزوریاں رنگ لے آئیں جو ہمارے قومی اخلاق میں، ہماری قومی تنظیم میں اور ہمارے سیاسی نقشے میں موجود تھیں۔

پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لیے اُٹھی تھی اس کی تدبیرِ مدافعت کا خلا صبر نہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لیے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جاسکتا تھا۔

مشرقی پنجاب، دہلی اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ یکایک ٹوٹ پڑا تو وہ قومی تنظیم جس پر کئی سال سے مسلمان اعتماد کیے ہوئے تھے ان کے لیے بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ ہر جگہ کے مقامی لیڈروں اور قومی کارکنوں میں سے ۱۹۵۰ء کی صدی سخت ناقابلِ اعتماد نکلے۔ انہوں نے عین وقت پر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور صرف اپنے بچاؤ کی فکر کی۔ ان محافظینِ قوم نے وہ اسلحہ تک جو مسلمانوں کی مدافعت کے لیے فراہم کیے گئے تھے زیادہ دامن پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کرنے میں قائل نہ کیا۔ انہوں نے خطرے کے علاقوں سے مسلمانوں کو بچا کر نکالنے کے بجائے اپنے جانوروں اور اپنے پیش کے سامانوں کو نکال لانا زیادہ ضروری سمجھا۔ انہوں نے پاکستان کے سرکاری ٹرکوں پر پناہ گزینوں کو بٹھانے کے لیے بھی رشوتیں وصول کیں۔ انہوں نے کیمپوں میں ایک ایک دانے کے لیے ترسنے والے پناہ گزینوں کے ہاتھ بھی وہ روٹیاں ہنٹے دامن میں پی جو سرکاری خرچ پر بھی گئی تھیں۔

پھر مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تعمیر سے جو غفلت برتی گئی تھی اس نے اپنے بدترین نتائج پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف دکھائے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے بڑے بڑے علاقے محض دہکیوں میں خال کر دیئے، انہوں نے انتہائی بے غیرتی کے منظر جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ایک ایک سکھ کے آگے پچاس پچاس مسلمان زمین بوس ہوئے، اور اس کے ساتھ عین اُس

قیامت مغربی کی حالت میں بھی مسلمان نے مسلمان کو لوٹنے میں، اور اندازاً اسی ضرورت کی چیزیں اپنے مصیبت کے ساتھیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کے داموں بیچنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ دوسری طرف مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں نے، ان کے لیڈروں اور قومی کارکنوں نے، ان کے منتخب کیے ہوئے ایم ایل اے صاحبان نے اور ان سرکاری ملازموں نے جو کسی قومی درد سے بہت ترپا کرتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے مال ٹوٹ ٹوٹ کر جس طرح اپنے گھر بھرے اپنے پناہ گزین بھائیوں کے بسنے میں جو مشکلات پیدا کیں، مصیبت کے مائے ہوتے مسلمانوں کے ساتھ جس دہشت گردی کا سلوک کیا، اور پاکستان بنتے ہی بنے نظمی، نافرمانی شناسی، رشوت، غیانت، اقربا پروری اور ظلم و بے انصافی کی جو گرم بازاری کی اسے دیکھ کر یہ بالکل عیاں ہو گیا کہ سیرت و اخلاق کے بغیر نرے جھنڈوں، نعروں اور جلوسوں کے بل پر کسی قوم کو اٹھانے کے کیا نتائج ہوتا کرتے ہیں۔

اس سارے نامہ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم اچھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قومی ریاست بنوا دی۔ لیکن انہوں نے کہ اس "ردش" کا ناسے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور ہری طرح ان کا فیادہ بھگت ہے ہیں تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک مجموعہ تھا۔ سرحدات کا تعین گفت و شنید سے طے کرنے کے بجائے دو کمیشنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی ترکیب ایسی قبول کی گئی جس سے فیصلہ کا اختیار کلیتہً صدر کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ صدر بھی کسی غیر جانبدار قوم کا آدمی نہیں بنایا گیا بلکہ انگریز قوم سے لیا گیا جو ہندوستان میں نہ غیر جانبدار تھی نہ بے غرض۔ پھر اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے اختیارات بھی اس شخص (لاڈلہ واٹس) بیٹن کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے جو صرف ہندوستان کا گورنر جنرل رہ جانے والا تھا اور ہماری قیادت غلطی نے پیشگی یہ قول دیدیا کہ اس فیصلے کی رُوت سے جو بھی سرحدیں مقرر کر دی جائیں گی انہیں وہ بے چون و چرا مان لے گی۔ اس شدید غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمان اکثریت کے متعدد علاقے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیئے گئے، مشرقی پنجاب کی پوری تحصیلیں جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ گورکھ پور

لاضلع ہندوستان میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے ہندو ریش کو ہندوستان کے ساتھ تعلق جوڑنے کا راستہ مل گیا۔

انتقالِ اختیارات کی جو صورت لارڈ مائونٹ بیٹن نے تجویز کی تھی وہ مریخ طور پر پاکستان کے حق میں سخت مضر تھی، مگر ہماری قیادت غلطی نے اسے بھی جوں کا توں قبول کر لیا۔ پاکستان کے حصّہ کی فوجیں جگہ جگہ منتشر تھیں، اس کے حصّے کا سامان اور فوجی ذخائر بھی ہندوستان کے قبضے میں تھے، اس کے حصّے کا سرمایہ بھی ہندوستان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کے دفاتر اور اس کا عملہ تک ابھی پوری طرح منتقل نہ ہوا تھا، اور اس حالت میں پاکستان کی مستقل مملکت منظم و نسق اور دفاع کی پوری ذمہ داری کے ساتھ قائم کر دی گئی۔ آج یہ اسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے جس آدمے حصّے کو انہوں نے ہندو اقتدار کے چنگل سے نکالا ہے وہ بھی اُس کے دھاڑے سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ جو ناگڑھ پر انہوں نے زبردستی قبضہ کیا اور ہم اپنی بے بسی کی وجہ سے اُنکی تک نہ ہلا سکے، کشمیر کے مسلمانوں کو وہ ہمارے سامنے پامال کر رہے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ میں کُل کر ٹرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ہماری کئی اُن سے دلی ہوئی ہے اور ہم ہر موقع پر ان سے دبے چلے جا رہے ہیں۔

آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ مائونٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے کہ مائونٹ بیٹن ہماری بربادی کے سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم اور ساری دنیا کو اس شرارت کی اطلاع دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے چلے گئے جو مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن تھا؟ کیوں آپ نے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ مائونٹ بیٹن اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہے اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہیں؟ صرف یہی نہیں کہ اس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرز تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہو گئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں، دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو سامراج کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل پیش کیا گیا تھا کہ اسلام

کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمائے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اُس قیادت کے حوالے کر دیئے جو اُن کے قومی مسئلے کو اس طرح حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کا نام ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اُڑٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ اُس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر اُڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کار فرمائیوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اس پر اعتماد کریں؟

(ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۴۸ء)

تقسیم کے بعد سامنے آنے والے مسائل

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان مسائل کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے بھی رہتے ہیں، لیکن عام طور پر جو بحثیں پڑھنے اور محنت سے آتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے، کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کی اہمیت ہے، اور کس طرح وہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کشش یہ ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل کیا اور رکھا جائے۔ وہ اس کی توجہ ان سے ہٹا کر منگامی معاہدات کی طرف پھرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے اب تک وہی نشہ پلاستے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے پلا رہے تھے۔ وہ اسے تھپکیاں دے دے کر مطمئن کر رہے ہیں کہ یہ مسائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لیے کچھ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ، اور خواہ کسی پارٹی کی اغراض کے لیے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہر حال قوم کی غیر خواہی کا ان میں ثابتہ تک نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے

مسائل رکھ دیے جائیں جن سے اس کو عہدہ برآ ہوتا ہے۔ پھر اسے یہ سوچنے کی دعوت دی جائے کہ آیا وہ اپنی موجودہ حالت میں ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو الحمد للہ، اور نہیں ہے تو اسے لامحالہ اپنے اندر تبدیلی کرنی ہوگی اور غور کرنا پڑے گا کہ وہ تبدیلی کس نوعیت کی ہو۔

ہمارے لیے اس وقت سب سے زیادہ نازک اور سب سے بڑھ کر دلائش مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی، یعنی ہماری قوم کا پورا نصف حصہ۔ تقسیم کے بعد ان میں سے کئی لاکھ فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ایک بڑی تعداد جبراً غیر مسلم بنالی گئی، ساڑھے ستر لاکھ پاکستان میں دھکیل دیئے گئے اور دس پندرہ لاکھ کو حیدرآباد میں پناہ لینا پڑی۔ اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔ یہ باقی ماندہ مسلمان آج انڈین یونین میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روس کے ماتحت مغتوج جرمنوں کی اور امریکہ کے ماتحت شکست خوردہ جاپانیوں کی ہے۔ دس سال کی تلخ و تیز قومی جنگ کے بعد اب وہ بالکل بے بسی کے ساتھ اپنے سابق حریفوں کے قبضے میں ہیں۔ انہیں "پاکستان زندہ باد" کی وہ قیمت دینی پڑ رہی ہے جو ان کے شہری حقوق ہی کو نہیں، انسانی حقوق تک کو کھا گئی ہے۔ وہ سب "غدار" اور سب "جاسوس" ہیں، ہر ایک کی وفاداری مشتبہ ہے۔ ہر ایک کے لیے خاندان تلاشی اور گرفتاری متقدّم ہے الا یہ کہ کسی کی باری آنے میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پوری قوم اصل میں یرغمال بن چکی ہے۔ اس کے لیے عزت کی زندگی کا دروازہ بند ہے اور مرگ تین راستے کھلے ہوئے ہیں: یا تو یرغناور غیبت مرتد ہو جائے، یا اچھوتوں سے بدتر حالت میں رہے، یا پھر خاموشی کے ساتھ ان سب تدبیروں کو برداشت کرتی چلی جائے جو اس کی امتیازی ہستی کو مٹانے اور اسے ہندو قومیت میں جذب کرنے کے لیے عمل میں لاتی جا رہی ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی جاری رہی تو مستقبل قریب میں مسلمان

لے اُس وقت تک حیدرآباد کا سقوط نہیں ہوا تھا اور اُس پاس کے علاقوں سے کئی لاکھ مسلمان اس ڈوبتی ہوئی کشتی میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ (جدید)

ہندوستان سے اسی طرح غائب ہو جائیں گے جس طرح وہ اندلس (اسپین) اور مغلیہ (سلسلہ) سے غائب ہو چکے ہیں۔ لا قدر اللہ۔

چار کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم اشان قوم اس وقت بالکل بے مہار ہے۔ جس سیاست پر اب تک اس کا دایہ کار تھا اس کی بساط انقلاب کے ایک ہی پلٹے نے الٹ دی۔ جس قومی تنظیم پر اس کا سارا اعتماد تھا وہ طوفان کا ایک تھپیڑا بھی نہ رہ سکی۔ جن لیڈروں کے ہاتھ میں وہ اپنے معاملات سونپ کر مطمئن ہو بیٹھی تھی وہ اس کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ ان کے کچھ اکابر تو خاموشی کیساتھ اٹھ کر پاکستان چلے آئے، اور باقی اکابر و اصا غریب دشمنوں کے آگے توبہ و استغفار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سیرت و اخلاق کے بغیر جو لوگ محض نعرہ دہن کے بل پر لیڈر بنے تھے وہ نہ نئے کارڈ بدل جانے کے بعد ایک دن بھی اپنے قبلے کی سمت استوار نہ رکھ سکے۔ انقلاب کی پہلی ہی ناکستہ وہ اپنے اُن نظریات اور اصولوں کو طلاقِ مُغلط دے بیٹھے جن پر دس سال سے وہ اپنی قوم کو نظر آ رہے تھے۔ دو قومی نظریہ یک نخت ان کے نزدیک باطل ہو گیا۔ یک قومی نظریے کی صداقت اچانک ان پر منکشف ہو گئی۔ ترنگے جھنڈے کی حقیقت یکایک ان کے دل میں گھر گئی۔ چند روز کے اندر ان مجاہدین ملت کو وطن پرستی میں ایسا شرح صدر نصیب ہوا کہ ان کے حلقے سے غلو و ہندو مسلم شادیوں تک کی تجویزیں آنے لگیں تاکہ مسلم و ہندو کے اندر سے یہ کم نخت من دیگرم تو دیگری کا احساس تو کسی طرح دُور ہو! اس پورے گردہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھرنے کے بعد سر دے سکتا۔ سادی جماعت بازی گروں سے پٹی پٹری تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اُس قوم کی رہی رہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ فائدے سے بنے ہوئے تھے۔

اس سے مایوس ہو کر اس ڈوبتی ہوئی قوم نے اُن تنکوں کا سہارا لینا چاہا جو پہلے سے کانگریسی دیدیا کی سلج پر تیر رہے تھے، مگر اب وہ بھی اس کے لیے بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گردہ اب بھی وہی راستے رکھتا ہے کہ مسلمان اپنے امتیازی وجود کو خود بخود بحال جائیں اور ہندی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفظ ذات کا نہیں بلکہ "آسان بھیری" کا نسخہ ہے جو مسلمان کے مزاج کو نہ پہلے اس آیا تھا اور نہ اب اس آ سکتا ہے۔

دوسرا گروہ کچھ مسلمان کے "مستقل وجود" اور کچھ اس کے "حقوق" کا بھی تصور رکھتا ہے، مگر یہ نام زبان پر آتے ہی پرانے سے پرانا لائنگوی مسلمان بھی ہندو قوم پرستوں کی نگاہ میں بس ایک نقاب پوش مسلم لیگی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت حقیقت ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ تقسیم نے ہمیں کاٹ ضرور دیا ہے، مگر وہ ہیں ہماری ہی قوم کا ایک حصہ، اور معمولی نہیں پورا ہے حصہ۔ ان کو ہم یوں ہی مٹنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا ہم پر سب سے بڑا حق ہے، اس لیے کہ جس پاکستان سے ہم متعلق ہو رہے ہیں اس کی اصل قیمت انہی نے ادا کی ہے۔ وہ اس لیے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ ہمارا بہترین مردم خیز حصہ وہی ہیں۔ انہیں اس بنا پر بھی تفریق غافل نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری مسز ارسالہ تہذیب کے تمام جدید ثمرات اور ہمارے تمام بڑے بڑے معابد (Institutions) اور تہذیبی مراکز کے امانت داند ہی ہیں۔ اور سب سے بڑا جو کہ کہ آخر ہم ٹھنڈے دل سے یہ بات کہے گوارا کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے پچھلے ایک ہزار سال میں جو محنتیں اور جو جانفشانیاں اسلام کے پیغام کو اکناف ہند میں پھیلانے کے لیے کی ہیں ان سب پر پانی پھر جاتے اور توحید کی دعوت سمٹ کر بڑے عظیم ہند کے صرف دو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود ہو جاتے۔ لہذا کوئی شخص بے پروائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ ان کا اپنا مسئلہ ہے۔ نہیں یہ پاکستان کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے، اور فی الواقع یہ اس پوری ملت اسلامیہ کا مسئلہ ہے جو اس مصنوعی تقسیم کے باوجود اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہی ملت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان چار گروہ مسلمانوں کو بچانے، اور ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تک چونکہ قومی حیثیت سے ہمارا مدار کار بالکل مسلم لیگ کے نظام اور اس کی قیادت پر رہا ہے اس لیے یہ سوال لازماً اسی کی طرف پھرتا ہے۔ کیا تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت غلطی نے اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کیا تھا؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت کے لیے کام کرنے کا اب کوئی موقع ہے؟ کیا پاکستانی مسلم لیگ اس بارے میں اپنے پاس کوئی ہاتھ چھلی رکھتی ہے؟ کیا پاکستان کی موجودہ

حکومت اس قابل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر کوئی اچھا اثر ڈال سکے یا ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کو درخشاں نہیں تو کم از کم محفوظ ہی کرنے کے لیے کچھ کر سکے، اگر ان سوالات کا کوئی جواب ہے تو اسے معلوم کر کے ہم بہت خوش ہوں گے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک ہمارے قومی معاملات کی سربراہ کاری موجودہ سیاست و قیادت کے ہاتھ میں ہے، اپنی ملت کے اس سب سے بڑے مسئلے کا کوئی حل ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، اور یہی سیاست و قیادت ہماری سربراہ کاری ہی تو ہمیں چند سال کے اندر یہ دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ واہگہ سے اس کماری ملک اور مشرقی بنگال کی سرحدوں سے لائٹ ہاؤس کے سوا حل تک کا پورا علاقہ اسلام سے خالی ہو جاتے۔

دوسرے مسائل پاکستان سے متعلق ہیں۔ جو مان سب مسائل کو لپیٹ کر صرف ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کا دفاع اور استحکام" اور اس کا حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی مل کر ایک ہو جائیں اور فوجی حیثیت سے مضبوط ہوں۔ لیکن تھوڑا سا تجزیہ کرنے ہی پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ پاکستان کا دفاع و استحکام کوئی ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اور اس کا حل بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ایک ملک جس کے اخلاق کو گھٹن لگا ہوا ہو، محض اسلحہ اور فوجی تربیت کے بل پر کھڑا ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ملک جس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور باہم تصادم کرنے کے لیے بہت سے طاقت و اسباب موجود ہوں، اس کا ایک ہو جانا کی تسبیحیں پڑھنے سے واقعی ایک ہو سکتا ہے؟ پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی و سادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھرنے کی کوشش کریں، ہمیں واضح طور پر یہ دیکھنا چاہیے کہ فی الواقع پاکستان کا بقا و تحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اولین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویشناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کارفرما ہیں۔ اس بجائے کہ ہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری

سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اثر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نہر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لیے اتنا خوفناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوتِ حیات کو کھا گیا ہے اور کھائے چلا جا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بد اخلاقی کا جو طوفان اٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کو بہا لے گیا۔ قتل و خون، آتش زنی، اور گوردوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوتی ہوگی، لیکن لوٹ مار کی آگ آتش نے لاکھوں کو موت کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی بدست کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈھائی ہزار آبادی میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصہ لینے سے پرہیز کیا تھا، اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے مشکل ۳۵ گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پیران لٹیروں میں محض جاہل عوام اور ہزاری لوگ ہی شامل نہ تھے۔ بڑے بڑے شرفاء اور معززین، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے، بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہاتے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر امن و انتظام کے ذمہ دار مجسٹریٹ، حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے نامور قومی کارکن، اسمبلی کے ممبر اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دنیا ان کو جانتی ہے اور شرمِ مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب گھل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بُری طرح ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہزار ہا آدمی ایسے موجود ہیں جو قتل و خون کے مشاق ہو چکے ہیں، ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بدے بدتر جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور نیچے سے لے کر اُوچے طبقات تک کم از کم ۵۰ فیصدی تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں جرائم کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی قائل نہیں ہے بشرطیکہ انہیں قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لیے یہ کوئی دیر تسلی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو ہر انہوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اتر گیا ہے۔ کیا مشاق مجرموں

اور بے باک خاتون کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لیے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بد اخلاقیوں بول بال غیروں کی جان مال اور صحت کے معاملے میں برقی گئی تھیں؟ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور اپنا کرتی پائدار اثر ہماری میرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیسے یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں پر ہاتھ صاف کرنے سے رُکے رہ جائیں گے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گزشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہ تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوفناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو دشواریاں نظر آئی ایک نئی مملکت کو پیش آیا کرتی ہیں وہ تو ہمیں پیش آنی ہی تھیں، اور جو مصائب انگریز ہندو اور سکھ کی باہمی سازش سے ہم پر نازل ہوئے وہ بھی اپنی جگہ تھے، لیکن یہ سب کچھ بڑی آسانی سے اٹھایا جاسکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے سربراہ کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ اخلاق کی خرابیوں نے ہماری مشکلات اور مصیبتوں کو، جتنی کہ وہ تھیں، اصل سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔

مثال کے طور پر مہاجرین کے مسئلے کو لیجیے جو پاکستان بننے ہی ایک پہاڑ کی طرح ہم پر نازل ہوا۔ بلاشبہ ایک ملک کے لیے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں کہ اس پر ساٹھ ستر لاکھ بے سر و سامان آدمی ایک سخت فکر ڈال دیئے جائیں۔ لیکن خود سے دیکھیے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقتہً ردنا ہوتی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں نے کر دیا۔ ہندوؤں

لے آخری اعداد و شمار کی روش سے پاکستان میں پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ۹۰ لاکھ تھی۔ لیکن ان کو بسانے میں جو کمالات دکھائے گئے ان کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۹۵۱ ار کی مردم شماری کی روش سے سندھ چھوڑ کر جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۹ لاکھ تھی، مگر ہندوستان چھوڑ کر آنے والے ۵ لاکھ چالیس ہزار مسلمان وہاں بسائے گئے۔ اور سرحد سے جانے والے غیر مسلم ۶۹۶۰۰۰ تھے، مگر ہندوستان سے آنے والے صرف ۵۱ ہزار مسلمانوں کو وہاں بسایا گیا۔ مہاجرین کو آباد کرنے کا مسئلہ سالہا سال سے پاکستان کے لیے دردِ سر بنا ہوا (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

اور سکھوں نے جو عمارت، سامان، اموال، دکانیں، کارخانے، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے، حکومت کے عمال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا ہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دقتیں پیش آسکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں؟ مغربی پنجاب اور سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا، انداس کا کتنا حصہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا؟ اگر یہ اعداد و شمار دشمنی میں اُجائیٹ تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ ہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حتم میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھیں گے۔

پھر جو لوگ کل تک "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے، جن سے بڑھ کر قوم کے درد میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور جو آج بھی لبان سے بہت بڑے "مجاہد ملت" بنے ہوئے ہیں، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئے گی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت خوریاں، یہ خیانتیں، یہ غبن، یہ قومی فحش پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں، یہ فرائض سے غفلت، یہ ڈسپلن سے گریز، یہ فریب قوم کی دولت پر عیاشیاں، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظام حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہل کاروں سے لے کر بہت سے

دبقیہ حاشیہ (صفحہ ۳۱۹) ہے اور اس وقت تک بھی اسے پوری طرح حل نہیں کیا جاسکا ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا، حتیٰ کہ جون ۱۹۵۱ تک بڑھتے بڑھتے ان کی تعداد ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی، اور یہ اس حال میں ہوا کہ مغربی جرمنی سے جانے والا کوئی نہ تھا جو اپنی جائداد خالی چھوڑ گیا ہو۔ اس کے باوجود جرمنوں نے پناہ گزینوں کو بڑی خوبی سے بسایا بھی اور کام پر بھی لگایا، بلکہ ہاجرین کا یہ سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

عالی مقام حکام اور وزراء تک، آلودہ ہیں، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ مدکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم، جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصہ نااہل اور ناجائز ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لیے، نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامل نہ کرنا، کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو سکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واہگہ اور لاہور کے درمیان پڑی مٹر رہی تھیں اور کمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۳ لاکھ مسلمانوں کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا ہے اور اس کے عزیز بزدلوں کو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے ہجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو بلا کر ان پر حملہ کر دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جاتے۔ حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچ کر آگئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں۔۔۔۔۔ اس قسم کے واقعات خاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے علم میں آتے ہیں، اور ان شرمناکہ جرائم کے ترکیب صرف عام شہد سے ہی نہیں تھے۔ کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہوتے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو سکیں گے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر کے لیے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دے گا؟

فقوڑی دیر کے لیے ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو سنبھالنے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لیے

کیا کر رہی ہے؟ اخلاق بنانے اور سنوارنے کا کیا سر و سامان اس کے پاس ہے؟ کیا تداویر اس کے پیش نظر ہیں؟ کیا لائحہ عمل اس نے بنایا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا چاہیے۔ اگر اس کے جواب میں اُن نصاب کی طرف اشارہ کیا جلتے جو کبھی کبھی ریڈیو اور سرکاری پریس اور تقریروں کے ذریعہ سے پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہل کاروں کو کی جاتی رہتی ہیں، تو ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں کہ اس طرح کی طفل تسیلوں سے ہمیں معاف رکھا جائے۔ اس لیے کہ بد اخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود قصر قیادت کے ستونوں میں شامل ہیں۔ کارفرمائی اور کارپردازی کی باگیں تو اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی بڑی اکثریت ہی کے دم قدم سے بد اخلاقی کا ہزار گرہ ہے۔ پھر بھلا خیانت کی زبان سے امانت کا سبوت، خود غرضی کی زبان سے ایشیا کا وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس انسانی فطرت نے کب قبول کیا ہے کہ یہاں اس کے کارگر ہونے کی توقع کی جاتے!

دوہرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی، اس کے بقا اور اس کے استحکام کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک بنیان مریض بنایا جائے؟ یہ عناصر اس وقت شدت کے ساتھ باہل انتشار نظر آ رہے ہیں، اظہار ہے کہ کسی چیز کے عناصر ترکیبی ہی اگر مجتمع اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا سمجھ دشوار ہوتا ہے۔ اُس کے اجزائے وجود میں پرانگندگی کا رجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہذا اگر یہ واقعہ ہے، اور کون ہے جو اس کا انکار کر سکتا ہو، کہ پاکستان کے ترکیبی عناصر میں جمع و تالیف کے بجائے کچھ انتشار و پرانگندگی کے رجحانات، پائے جاتے ہیں اور کچھ تو میں اُن کو بڑھانے میں لگی ہوتی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے بندہ استحکام، بلکہ عین ہماری بندش و بندہ ہی میں ایک خطرناک رخنہ موجود ہے جسے دور کیے بغیر ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے ان میں تین تفریقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔ پہلی تفریق مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد اس وقت ۱۰ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر

حقہ سے مسلمان اکھڑا کھڑا کر برابر پاکستان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ مشرقی ہند کے لوگوں کا رخ مشرقی پاکستان کی طرف ہے اور باقی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی راہ لے رہے ہیں۔ یہ نیا عنصر اب ہماری آبادی کا ایک مستقل عنصر ہے اور تعداد کے لحاظ سے کوئی معمولی عنصر نہیں ہے۔ لیکن متعدد اسباب ایسے ہیں جو سنئے اور پرانے عناصر کو مل کر ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ کچھ تو زبان، تہذیب، معاشرت اور عادات و خصائل کے تمدنی اختلافات ہیں جو بہر حال ایک مدت تک یگانگت میں مانع ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان پر غیر معمولی اضافہ جس چیز نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ ہاجرین اور غیر ہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور انسانی خود غرضیاں کار فرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں عناصر کو بھاڑ رہی ہے، ان کو مخالف جھٹوں کی شکل میں منظم کر رہی ہے، ان کے درمیان آویزش کی صورتیں پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خود غرض مفسدین ان کو باہم لڑا رہے ہیں۔

دوسری تفریق جغرافیائی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اول تو وہ ایسے خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزاء سے مرکب ہیں اور ہر جزو دوسرے جز کے خلاف تعصب رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں، پانچ مختلف قومیں ہیں جو مصنوعی طور پر ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔ ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رُخ حمان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان

لے ۱۹۵۰ء میں کھوکھرا پار کے راستے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۲,۶۴,۸۹۹ تھی، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تعداد ۶ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے، لاکھ مسلمان زیادہ تر بہار سے مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ (جدید)

۱۱۔ مشرقی پاکستان میں نہ صرف ہاجرین، بلکہ تمام غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ خود مسلمانوں نے آخر کار وہ سلوک کیا جو دندگی و سفاکی میں اس ظلم سے بھی بازی لے گیا جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ (جدید)

گروہ اس کو شدید تر کرنے کی پیہم جدوجہد کر رہے ہیں۔

تیسری تفریق معاشی ہے۔ امیر اور غریب، زمیندار اور کاشت کار، مزدور اور سرمایہ دار، بڑی تنخواہیں پانے والے انسداد چھوٹے اہل کار، یہ مختلف گروہ ہیں جن کو معاشی بے انصافیوں نے ایک دوسرے سے پھاڑ دیا ہے۔ ان کے درمیان اخوت اور ہمدردی کا تعلق نہیں ہے بلکہ حسد اور بغض کا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ذمہ اور حامی و ناصر نہیں ہیں بلکہ حریف اور متقابل ہیں۔ ان کی کشمکش بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہمارے اندر ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کا مستقل فلسفہ ہی یہ ہے کہ انہیں ملا کر ایک کرٹینے کا خیال باطل ہے اور حق صرف یہ ہے کہ ان کو باہم لٹا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ مختلف تفریقیں، جو ہماری قوم اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے پر تلی ہوئی ہیں جن کو نشوونما دینے کے لیے گہرے داخلی اسباب بھی موجود ہیں، اور جنہیں بھڑکانے کے لیے خارجی محرکات کی بھی کمی نہیں ہے، آخر کس طریقے سے مٹائی جاسکتی ہیں؟ طاقت کے ذریعہ سے ان کو

لے قریب پاکستان کے دقت مسلم قومیت اور مسلمانوں کی قومی وحدت کا صور جس طرح بھونکا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی تھی کہ یہ مختلف نسل، جنسراتی اور لسانی عناصر ایک اسلامی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں اور جاہلیت کی یہ تفریقیں ان کے اندر باقی نہیں رہی ہیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ہی ان تفریقوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اور تفرقہ پر داندوں نے ان جاہلیت کے تعصبات کو ابھارنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ مگر جو لوگ گزشتہ ۲۵ سال میں پاکستان کے معاملات کو چلا رہے تھے انہوں نے ان عناصر کو ایک وحدت میں جذب کرنے کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس تفرقہ پر داندوں کی اُلٹی جھولہ افزائی کی۔ اسی کا خمیازہ ہے کہ آج مشرقی پاکستان تو ہم سے کٹ کر الگ ہی ہو چکا ہے، اور باقی ماندہ پاکستان میں بھی چار قومیتوں کے نعرے غلامیہ لگ رہے ہیں۔ (جدید)

۲۵ سال میں پل کر غرب جو ان ہو چکا ہے اسباب اسلام کے ملک میں غلامیہ سوشلزم کی دعوت بلند کی جا رہی ہے جو مسلم معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر کے ان کے درمیان طبقاتی جنگ برپا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ (جدید)

دبا کر ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک حد تک ممکن ہے، مگر یہ چیزوں کو جوڑ کر وہ قلبی وحدت تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لیے ضروری ہے۔ پختے ہوسے دل اور کھینچے ہوسنے ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں بنیانِ موصوں بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی تصورات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس نے ملک کی آبادی میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی دھرد کا احساس جگا دیا جو اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر معاشی اغراض کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ بردار ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم ان دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ وہ مالی، صنعتی، انتظامی، دفاعی اور خارجی مسائل بھی اپنی جگہ کافی اہم ہیں جن سے ہم اس مملکت کی پیدائش کے بعد دوچار ہوتے۔ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جاتے۔ نہ ان واقعی خدمات کا انکار کرنا قرین انصاف ہے جو اس سلسلہ میں موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیات قومی کے لیے اس وقت سب سے بڑے مسئلے ہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل کھٹک امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں معطل نہ کر دے بلکہ ان کی اہمیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن - اگست ۱۹۴۰ء)

کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے؟

پاکستان کے قائم ہونے ہی پر بخش شروع کر دی گئی تھیں کہ اس مملکت کو ایک اسلامی مملکت بنانے میں کیا مشکلات اور قباحتیں درپیش ہیں، اور اس غرض کے لیے دلائل فراہم کیے جانے لگے تھے کہ اس کو ایک لادینی ریاست ہونا چاہیے۔ اس کا اندازہ اُس مباحثے سے ہو سکتا ہے جو ۱۸ مئی ۱۹۴۷ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا تھا۔ اس مباحثے میں سائل کی حیثیت سے وحید الدین صاحب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے سید ابوالاعلیٰ مودودی (

۱۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غائبانہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے؟

۲۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا نقطہ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہو گا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے، یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔

۳۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس

سیاست کا سیاسی اقتدار ماہرینِ دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہو گا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی حرکت کو سمجھائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لائے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ کو سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ سے وابستہ کر دیں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائے گی وہ ان کے سیاسی ترجمان کی آئینہ دار ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے منسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ اقتصادی کشمکش ایک لامتناہی فقہانہ بحث کی صورت اختیار کرے گی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جن کے تین دہرے کے دہرے رہ جائیں گے۔

اب جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اس رذع سے اور انصاف کے ان اصولوں سے محروم ہو گیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیتے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے اندر اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا، وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو چھاڑنے اور ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کی دہکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہندوؤں کی کشاکش کے ہونے کا نتائج جھگڑت چلے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے ہی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو ان اجتماعی فلسفوں کے حوالے کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ۔۔۔ طبقاتی جنگ۔۔۔ برپا کر دیں اور ہمیں اس وقت تک

امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو بلیا میٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی غوغا خیزوں کے نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے اُن لوگوں کو ابھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لگت تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالائے اتفاق یا اکثریت کے ساتھ جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی کثرت پتا ہی پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کئی چلپیٹے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں اُن کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ مجرد سے کے قابل سیرت رکھتے ہوں، اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

۱۔ میری ناچیز راستے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں صرف خلوص اور ایمان داری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت بڑا پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر پیچیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرا بڑا پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا بہتر؟ گورنر دار رکھنے کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو ذہنی پیشدادوں کے حوالہ کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کیلئے فقہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۲۔ آپ جب ”دینیات“ کا لفظ بولتے ہیں تو شاید ”دینیویات“ کو اس سے خارج کر دیتے

ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اُن ماہرین دینیات کے حوالہ کر دیا جو فتویٰ دینے سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ خدا اس پہلو پر بھی خود فرماتیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن اپنی سیاست اور اپنی معیشت کے مسائل اُن ماہرین کے حوالے کر دیئے جو صرف مغربی نظریات و تعلیمات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مَس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اُسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی مگر کے اندر طبقات خود غرضیوں کی کشاکش اور مگر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہو گا کہ ہم اپنی قوم میں اُن لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا، دونوں کو اُچی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری کشمکشوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری زندگی کو مادی دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنادے؟

س۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کے موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اندیشہ بھی پیش آئے گی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی نقلی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح مسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے غلط فہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مگر وہی کو ایسے۔ مگر کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ انحصارِ استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن تہذیب تجارت کو روتا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور تعلیمی طور پر پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علمائے

اقتصادیات پر فتوے لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں
ہاجنی سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بد حالی اس فتنے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز
قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

۲۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرماتے ہیں، ہر اس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس
کی روح کو چھوڑ کر صرف اس کے الفاظ لئے لیے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی ظلم اور بصیرت کی
کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون روح
سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں، مگر ظاہر داری کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی شکل بدلنے سے
استرازا کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام
مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز حبیب موجود
ہو گی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لیے اپنے اندر سے انہی لوگوں کو منتخب کریں گے
جو قرآن و سنت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ ان کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

۳۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی
اختلافات ہیں، ان کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات
مستقبل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

۴۔ ان اختلافات کی نوعیت دہی کچھ ہے جو ہماری دوسرے اختلافات کی ہے اور انہیں
بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی
معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو، ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق
مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے
کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل
کرنے کا جہود ہی طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اس نقطہ نظر کے مطابق چلے یا جائے
جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل القعد اور گروہوں کے نقطہ نظر کی زیادہ سے زیادہ
اتنی رعایت کی جائے جس کی احوال میں گنجائش ہو، نیز اقلیت کی حیثیت سے ان کے
حقوق کا منصفانہ تحفظ کر دیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاست اسلام

کے ان وسیع ترین اصولوں پر قائم ہوجن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ وہ نہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس جیسے اتفاق کر لیں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

۱۔ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ آپ کس طرح ان کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار بنیں؟

۲۔ اس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ پر ایک ملک کا نظام انہی اصولوں کے مطابق بننا اور چلنا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اُس کے نقطہ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اُس کے حقوقی شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن اندرون سے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اُس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اُس کی اس رائے کے مطابق بنے۔ اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے، مگر یہ کہنے کا اسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ یہ وفاداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اُس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جاتے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت تو یہ دیکھے گی کہ آپ اُس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو

اس ریاست میں دنا دارین کر رہنا ہے یا میزبین کر۔

۱۔ میری راستے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات، خصائل اور اعتقادات و تہذیب کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس انداز فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی رہایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی بہت دُور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

۲۔ آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُر زور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت، اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حقہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟ ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی

خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اُس کی طاقتوں اور اُس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پارہے تھے، بلکہ درحقیقت اُس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچنے کے لیے جارہا تھا اور ہم انتہائی نامانگار حالت میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۵ اگست، ۱۹۴۷ء کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک ہمارا حصہ ہوتا ہے؟ یا وہ طریقہ عمل اختیار کریگی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوتا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورت حال برقرار ہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اُس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیر تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

(ترجمان القرآن - جون ۱۹۴۸ء - بشکر یہ ریڈیو پاکستان)

پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نہیں نافذ ہو سکتا؟

ایک تقریر جو ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو ناکاراج لاہور میں کی گئی تھی
 (قیام پاکستان کے بعد ہی وہ عزرات پیش کرنے شروع کر دیئے گئے تھے
 جو کچھ لوگوں کے نزدیک یہاں اسلامی قانون نافذ کرنے میں مانع تھے۔ اس تقریر
 میں انہی عزرات کا جواب دیا گیا ہے)

آج کل کسی ملک میں — غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں —
 اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جائے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس
 سے آدمی کو مابقیہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی
 ضرورت کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لیے قابل عمل سمجھنا
 حماقت نہیں ہے؟ کیا اس ہندو، بدھ، جین، اور کھڑے برہمن کی وحشیانہ سزائیں دی
 جائیں گی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کریں گے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقہ کی
 فقہ جاری ہوگی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون
 اُن پر مسلط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تاثر توڑ رہے تھے شروع ہوتے
 ہیں اور یہ بات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان
 سے ادا ہوتی ہے۔

اے واضح رہے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہی طبقہ ان سوالات کے بارے میں خاموش تھا اور (باقی صفحہ ۳۳۶ پر)

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاتمہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سن کر طرح طرح کے دوسرے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دُور کی شناسائی اُنسیت کے بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوس ناک باب یہ بھی ہے کہ آج بعض اخیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین سے اور اپنے اسلام کے چھوڑے ہوئے عظیم الشان تہذیب سے نابلد اور متوجش ہیں۔ اس حالت کو ہم اپنا ملک نہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ پہلے مدت ہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشوونما معطل رہا۔ پھر محمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و دُور کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اُٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اُٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اُسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے یا دوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو مسیحی کامیاب نظر آ رہا تھا۔ اُسی سے انہوں نے اصول لیے، اُسی کے علوم سیکھے، اُسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اُسی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہل دین کا گروہ بالکل گوشہ خمول میں پھینک دیا گیا اور تمام مسلمان قوموں میں کارفرمائی کی باگیں اہل کارکن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آ گئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیبِ جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام اسلام ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے

(بقیہ حاشیہ ۳۳۵ سے) مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ ہمیں خود اپنے نظریہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے ایک الگ خطہ زمین درکار ہے۔ مگر وہ خطہ فراہم ہوتے ہی یہ سوالات اُٹھانے لگے۔ (جدید)

پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لیے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں ان کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوتے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دیتے جاتے تھے۔ اسی طرح جو مالک غلام تھے ان میں بھی تمام تہذیبی اداؤں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی

لاح اسلامی شریعت کی پینچ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا۔ مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقش قدم پر نجد وہ مالک بھی چل پڑے جن میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نوئے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا تک محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۴ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرنج کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرہ اختیار میں چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم اگے بڑھایا۔ انہوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزر لینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لیے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیا میں تعدد اذہاج کو قانوناً ممنوع ٹھہرایا گیا، اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان اور سعودی عرب دو ہی ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی رُوح وہاں سے بھی فانی ہے۔

قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اُسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد قومیں پہنچی ہوتی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتے تو وہ بیچاڑے مجبور رہیں کہ اسے ٹالیں یا دیبا تیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی ابتداء تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور فہمی و عملی تربیت انہوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی مدح و مزاج سے اتنی دور لے جا چکی ہے کہ اُس کو سمجھنا اُن کے لیے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاطانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اس وقت تک بیسویں صدی کے لیے بارہویں صدی کے مردانِ کارِ تہا کو کرنے میں مشغول ہے۔ اس لیے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں ہے جو اگر وہ ان مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین و قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ دانتی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس بڑے عظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر رڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی مستقل تہذیب، الگ نظریہ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں، ہمارے لیے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے جس کا نظام زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطہ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور اُتھک کشمکش کے بعد بالآخر ہمیں وہ خطہ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اُس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان و مال اور اُبردینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئینِ حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لیے اتنے پا پڑیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کا کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا بڑا تھا کہ اتنے رڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا؟ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ ”کارِ خیر“ بھی ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اتنی جانفشانی اور اتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرے

کی حاجت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آتے ہیں۔ اسلامی کے نفاذ کے لیے پابند کر چکے ہیں۔ ہمارے لیے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہذا چاہیے دوسری مسلمان قومیں کچھ کستی رہیں، ہمیں ہر حال اُن ساری ہم پسند گیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے اُن سب کو دور کرنے کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لیے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں۔ اور اُن کے عدم اطمینان کی وجہ اُن کی عدم واقفیت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اُس کا مقصد، اس کے اصول، اس کی روح اور اس کا مزاج کیا ہے۔ اُس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ اور اُس میں کون سی چیز اب تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اُس کے احکام کن مصلح پر مبنی ہیں اور اُن غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو اُن احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیل رہی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن تمام مطمئن ہو جائیں گے اور اُن کا اطمینان اُن ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دے گا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں۔

میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لیے ہے۔

قانون اور نظام زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیے۔ اس سوال کا دائرہ اُس دائرہ سے بہت وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "ہونا چاہیے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل

ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی میرٹ و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ اُن کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی مدد سے ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلہ اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقہ پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابط عمل معین کرتے ہیں۔ اور قانون اُن بہت سے مجموعوں میں سے صرف اُن جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لیے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اُسی دائرے تک محدود رکھے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوچنا چاہیے کہ اُس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قانون اُسی اسکیم کا ایک جز ہے اور اس جز کے مزاج کو سمجھنا یا اس کے متعلق کوئی راستے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کل کو سمجھا جائے۔

منظوم زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں "کیا ہونا چاہیے" کے سوال کا جو جواب ہم دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال معنی "کیوں ہونا چاہیے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "کیا ہونا چاہیے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل اُن نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اُس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کیے ہیں، اور اُن نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اُس ماخذ یا اُن ماخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے اُن نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لیے ہوتے نہیں ہیں بلکہ ان کے ماخذ ایک دوسرے سے مختلف

ہیں۔ اس اختلاف کے باعث اُن کے نظریے مختلف ہوتے، اُن کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر اُن اسکیموں کے جوہر سے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور اُن کے ماخذ اور اُن سے وجود میں آنے والے پورے نظام حیات کو مجھے بغیر صرف اُس کے قانونی حصہ کے متعلق کوئی راستے قائم کر سکیں اور وہ بھی اُس قانونی حصہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اُس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اڑتی ہوئی خبریں سن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظام زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظام زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ اُن کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائے گی، اس لیے میں صرف اسلامی نظام زندگی کی تشریح پر اکتفا کروں گا۔

اسلامی نظام زندگی کا ماخذ

اسلام جس نظام زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف ایڈیشن قدیم ترین زمانے سے توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دنیا میں شائع ہوتے رہے اور آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں ”الکتاب“ (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اُس کے ایڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس کتاب کو لے کر گئے اور جنہوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشا کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نورع، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) (مجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک ہی گروہ کے اشخاص ہیں جہاں ایک ہی مشن لے کر اُٹھے تھے، ان سب کو ایک جامع نام ”ارسل“ سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریہ زندگی

اس "الکتاب" اور "الرحول" نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو ہمیں مریخا ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آ رہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اُس کی بے پایاں سلطنت کے لائندہاد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اُس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیداوشی رعیت (Born Subjects) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اُس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اُس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں ہی رہے ہو بلکہ اُس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لیے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی ملکی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ محل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبیعی (Law of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک مانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اوپر فطرت کی قوانین اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی تمہارا اُن سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیداوشی رعیت ہونے کی حیثیت تمہیں اختیار کرنا چاہیے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔

حق کا بنیادی تصور

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اولین بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام چھوٹے

سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ ”الکتاب“ اور ”الرسول“ نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امر واقعہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حق میں بھی اُسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اُس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصے کا اور اُس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لیے بھی حق ہے کہ انسان جن توہین اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب خدا کی ملک ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جس ملک میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے۔ اور اس لیے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیاست انسان کی ہموازی و موافقت (Harmony) کا تقاضا ہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصوں کا حاکم اور سرچشمہ احکام ایک ہی ہو۔ ان دو حصوں کے دو ملک اور ایک دوسرے سے مختلف تیلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے، مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور فساد سے بھر جاتی ہے۔

”اسلام“ اور ”مسلم“ کے معنی

”الکتاب“ اور ”الرسول“ انسان کے سامنے اسی حق کو پیش کرتے ہیں اور اُس کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر اپنی خوشی سے اس کو قبول کر لے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اُس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے انسان کو خود ہی اختیار دیا ہے اس لیے یہ بات کہ انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم بنے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرانی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اُس بیان واقعہ (Statement of Fact) پر ہو جائے جو ”الکتاب“ اور ”الرسول“ نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے کہ اس

واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (Surrender) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام ”اسلام“ ہے۔ اور جو لوگ تسلیم کا یہ فعل کریں وہ ”مسلم“ کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت

اب ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کیے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے ”مسلم“ سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے، اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے (Contract) کے ذریعے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شہوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اسی کی ہدایت ان کے لیے دستور زندگی ہے، اسی کے احکام ان کے لیے قانون ہیں، اسی کو فرمائیں گے جسے خدا خیر مانتا ہے گا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے ملے گا اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لیے کھینچ دے گا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ وضع طور پر یہ افراد کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں ”کیا ہونا چاہیے“ کا جواب بطور خود تجویز نہیں کریں گے بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔

ملے یعنی کسی نسل یا ملک میں پیدا ہونا، یا کسی زبان کے بولنے والوں میں پیدا ہونا یا کسی مبادیہ اور ماسخ قوم میں پیدا ہونا۔ (مجموعہ)

لئے یہ سوسائٹی چونکہ اتفاقی حوادث پر نہیں بلکہ ارادی عقیدہ و مسلک پر بنتی ہے، اس لیے اس میں ہر ملک ہر نسل و ہر زبان اور ہر زبان کے لوگوں کا امتیاز بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں، اور یہی چیز اس سے ایک عالمگیر سوسائٹی بناتی ہے۔ (مجموعہ)

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو ”الکتاب“ اور ”الرمول“ اُسے ایک ضابطہ زندگی دیتے ہیں جو ”شرعیات“ کہلاتا ہے اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے معاملات زندگی کو اُس سکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی مضبوط ہو گئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطہ زندگی اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور اُس کے لڑتے ہی وہ سوسائٹی مسلم کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقاً اگر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیر ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹ نہیں ہے بلکہ صرف ایک مجرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر پہلے گھر سے کہ شریعت اب اُس کا ضابطہ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کرے گی، یا کسی دوسرے مانتے سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فحش معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ ”مسلم“ کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اُس کے اصول

ان بنیادی اصول کی توضیح کے بعد اب ہمیں اُس سکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو انسانی زندگی کے لیے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لیے مناسب ہو گا کہ پہلے اُس کے مقصد اور اُس کے بڑے بڑے اصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اُس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معرفت پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معرفت سے مراد وہ نیکیاں، خیریاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور منکرات سے مراد برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا خیر برا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معرفت فطرت انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے اور منکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لیے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ ان بھلائیوں

کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بعلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا نہ ہونے کے مواقع باقی نہ رہنے دیتے جائیں۔

اس غرض کے لیے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشوونما میں کسی طود پر سبب راہ ہو سکتے ہیں۔ اس طے شدہ اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائل قیام و ترقی بھی معروف شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشوونما کا ذریعہ بنیں۔ سوائی کے پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جد ہر جد ہر سے وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دوسرے مندوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مباح یعنی جائز۔

(۱) فرض دو واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوماتی پر لازم کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوماتی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض

کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ موسماٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے مصالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی مانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو، یا جن کے معاملہ میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے، امد اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی ناپسندیدہ۔

حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیے گئے ہیں۔ رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر ملاحظہ، یا کنایہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی مرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ موسماٹی خود یا اس کے مصالح و مصلحتیں ان کا سد باب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

مردت اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہناؤ اور صحت، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت

نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور بُرائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صانع نظامِ زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا، اور نشوونما دینا ہے، کیا بُرائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوب بھلائیاں پروان چڑھیں اور بُرائیوں کا استیصال ہو۔

نظامِ شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا

یہ پورا نقشہ زندگی ایک ہی نقشہ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ میں چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا عالم وجود ہے نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کیے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ بڑا انسان یا بڑا انسان نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ اُن خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے۔ نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اُس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح انسانی جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ اعضاء کو الگ الگ لے کر آپ ان کے عین یا ان کے فائدہ سے کوئی متعلق بھی کوئی راستے قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے مناسب اور ان کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشہ زندگی کا ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کا۔ اس کے اجزا کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جدا جدا راستے بنی کرنا درست ہو سکتا ہے نہ مجموعہ سے الگ ہو کر اس کا کوئی بجز وہ کام کر سکتا ہے جو وہ صورت اپنے مجموعہ ہی میں رہ کر کیا کرتا ہے۔ اندازاً بعض اجزاء کو قائم کر کے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اُسے اُٹھایا جو حقانی اسلام قائم کر رہا ہے، اور نہ کسی دوسرے نظامِ زندگی میں اس کے کسی جز یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شاعر نے یہ نقشہ اس لیے بنایا ہے کہ یہ پورے نقشے کا پورا ایک ساتھ قائم ہو، نہ اس لیے کہ آپ حسبِ غشاء اس کے

کسی جُز کو جب چاہیں لے کر قائم کر دیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جُز دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جُڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح راستے صرف اُسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب کہ پورے نظام اسلامی کے تناسب اور اُس میں اس کو قائم کرتے ہوئے دیکھیں۔

اُج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جُز کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظام زندگی کے اندر رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جُز کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اُس کے حُسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانونِ زہداری کی بعض دفعات پرائج کے لوگ بہت ناک بھوں پڑھتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشہ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر ان کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو تو زہری ان دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اس نقشہ زندگی کے ہی خلاف ہے۔

بلاشبہ اسلامی قانونِ چمدی پر پادشاہ کاٹنے کی سزا دیتا ہے۔ مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لیے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اُس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو، جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لیے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسازروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب لوگوں کے لیے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقات کی اجارہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسبِ معاش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں، جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں نیا ضی، معیشت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرفتاروں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو

مومن نہیں ہے اگر تیسرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لیے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا۔ جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے۔ جس میں حاجت مند کے لیے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دُحکار اور پھٹکار ہے۔ جس کا اخلاق نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے۔ جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشرتی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعہ سے اُن کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو مجرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خود لوگوں کے مال کی حفاظت قانون کے پیش نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لیے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ خود ہی رضا کارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اُس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو۔ پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اُس کے لیے اسلامی قانون ہاتھ کٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریعت، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظام تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی خلوت معاشرت نہ ہو، جس میں بنی ستوری عورتوں کا منظر عام پر آنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق کا عام چرچا ہو، اند جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لیے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اشاروں کی تصویریں دکھائی ہوئی

ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سینا در میں عشق دسے رہے ہیں، نہایت گندہ لڑیچہ آزادی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، بنی سنوری خواتین کھلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظام معاشرت نے اپنے یہودہ رواجوں سے نکاح کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو ہمزادینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادی کا خطاب ملنا چاہیے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصے کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل ادبی جامع اسکیم کا جز ہے۔ یہ جز بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کل سے الگ کر کے اسے سمجھا جاسکے یا جاری کیا جاسکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجراء نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیش نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے، اور اُس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجراء صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عمل لحاظ سے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے۔ کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ بعض اور حصے ایسے ہیں جنہیں اسلام اپنے تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کرتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کے لیے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے اصلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لیے وہ تعاضلات ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لیے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظام زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے اُن احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لیے ایک نظام عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی انگری حقد وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے
پوری شریعت ہی قانون ہے، لیکن وہ حقیقت پر حاکم اعلیٰ کا مقرر کیا ہوا مجموعہ احکام ہے۔ لیکن چونکہ
اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کیے
جائیں، اس لیے ہم شریعت کے صرف اُس حصے کو "قانون اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے
کے لیے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔
اسلامی قانون کے اہم شعبے

(۱) اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے ایک دستوری قانون
(Constitutive Law) کی ضرورت ہے، مادہ شریعت کے اس کے تمام ضروری اصول مقرر
کر دیتے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے
شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنسبیا پر کسی کو حقوق شہریت ملتے
اور کس بنسبیا سلب ہو سکتے ہیں؟ غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ دیانت
کے قانون اپنا اختیار کیا ہے؟ حکومت کا انتظام کن اصولوں پر چلایا جائے گا؟ انتظامی اختیار
کس کے سپرد کیے جائیں گے؟ اُس کا تقرر کون کرے گا؟ کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا اور کن حدود
کے اندر کام کرے گا؟ قانون سازی کے اختیار کو کس کو کس حد تک حاصل ہوں گے؟ عدالت
کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت
نے ہم کو دے دیا ہے۔ پھر ان اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی
ہے کہ دستور کی تفصیل شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس
امر کے پابند تو ضرور کیے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مندر کیے ہوئے ان
اصولوں پر قائم رہیں، لیکن کوئی مستقل دستور ہر زمانے کے لیے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس
کے اخذ و رد میں تبدیلی بھی جائز نہ ہو۔

(۲) تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لیے ایک انتظامی قانون
(Administrative Law) کی ضرورت ہے، اور اُس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے
 واضح کر دیئے ہیں، اور مزید برآں اس معاملہ میں ہماری دہمائی کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

خطائے راشدین کی مثال حکومت کے نظام پر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لیے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی؟ حکومت کے معاملات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لیے حکومت پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ کون سی بھڑتیاں ہیں جنہیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لیے اسے کوشش کرنی چاہیے اور کون سی بھڑتیاں ہیں، جنہیں روکنا اور دھانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگان ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو بعض اصول ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم و نسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر نہیں دیا ہے جسے ایک ہی شکل و صورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہیں اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیل ضوابط بنانے کی پوری آزادی نہیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم ان اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کر دیتے ہیں۔

(۳) اس کے بعد کی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Personal Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصول ہدایات دیتی ہے کہ کسی دور میں اور معاملات زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دیتے ہیں وہ اب تک ہر ملک اور ہر دور کی موسائشی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہو سکتے ہیں بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو اور جو اصول ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملات زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جاسکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم

کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، اُن میں خود شریعت ہی کی رو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحابِ علم و عقیدہ باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں۔ اور اس طرح جو قوانین بناتے جائیں گے وہ قانونِ اسلام ہی کا ایک جز شمار ہوں گے، کیوں کہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بناتے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے نقہانے استھان اور مصالحِ مزلکہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام ممدون کیے تھے وہ قانونِ اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

(۴) سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لیے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لیے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں اور جہاں تفصیلات نہیں دیں وہاں ایسے اصول دے دیئے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمِ قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کون سی چیز اب تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔

اس قانون میں جو چیز اہل ہے وہ عین اجزاء پر مشتمل ہے:-

۱۔ قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چمادی اور لٹا اور قذوف کی سزائیں اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

۲۔ اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام

ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضا مندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

۳۔ حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادی عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعددِ ازدواج کیلئے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لیے تین کی حد، یا وصیت کے لیے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اہل اور قطعی واجب الاطاعت حتمہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدود اور بعد اس کی خصوص امتیازی شکل و صورت معین کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابلِ تغیر و تبدل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کو قابلِ ترمیم و تبخیر ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک گھٹلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیل مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پیدا ہے جہاں انسانی ترقیت فیصلہ خلتی کر کے "معروف" سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر یا مکرراً منع کر کے یا اصول بتا کر، یا حد لگا کر گویا نشانات (Sign Posts) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتار ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفر زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتد بہ حتمہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، گوہار کے دیکھتے دیکھتے تجسرات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو رُج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پردہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے متانوں اور ازدواج اور قانون میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھا ہوں۔

اس پائدار اور اہل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ

عصر کی اقسام پر مشتمل ہے۔

۱۔ تعبیر یا تادل احکام، یعنی کوئی حکم عن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہیں رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی کجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدل لاتی دوسری تعبیروں پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلاف تعبیر پہلے بھی امت کے اہل علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

۲۔ قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملنے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

۳۔ اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر ان کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

۴۔ استئذان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسب ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس مشابہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دائرہ کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد و استئذان ہوا تعبیر و قیاس، بہر حال اس کا ہمارا ہر کس و نا کس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ و کاہر حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے۔ اس کے لیے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ راستے زنی کا اہل نہیں مانا جاسکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی راستے زنی کا حق صرف ان ہی لوگوں کو دیا جاسکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیر احکام کے لیے ضروری

ہے کہ آدمی اُس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دیئے گئے ہیں، اُن حالات سے واقف ہو جن میں ابتدائی احکام دیئے گئے تھے، قرآن کے اندازِ بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرہ پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی طبعیت قافیہ میں رکھا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے ان کی باہمی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر تطبیق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے ایسے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاظمتِ زندگی کا عمدہ فہم ———— محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے فہم ———— درکار ہے۔ استحسان کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاجِ ابدی کے نظامِ زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحثات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظامِ زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ ان علمی اور فہمی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کسی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس موجود ہو۔ یقیناً یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پرفا ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر نگاہ جمائے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدیم پسند کر چکے ہوں جیسے لوگوں کے ماتحتوں اسلامی قانون کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، عمرِ عباس میں تخریب ہی ہو سکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب میں مختصر طور پر ان اعتراضات سے بحث کروں گا جو پاکستان میں اسلامی قانون کے اجراء کا مطالبہ سن کر بالعموم کیے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں، اس لیے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی فطرتاً کھول کر کی جاتی ہے لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

اتہمت برسدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پورا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور سٹیٹ کی ضروریات کے لیے کس طرح کافی ہو سکتا ہے؟

جی حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اُڑتی خبر لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کسل کہ اُس وقت سے یہ قانون بچوں کا توں اُسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنائے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لیے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیئے گئے تھے اُن پر اُسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور دوسرے پیش آئیوں کے معاملات میں تعبیر و تیس اور اجتہاد و استنباط کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقاء اول روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک اُدھی سے زیادہ ہند ب دنیا میں پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں اُن سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لیے بھی نہیں رکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور نوعداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سول کاؤتھ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رک گیا۔ لیکن اول تو یہ قطعاً کچھ آغا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم مقوڑی سی محنت و کادش سے اُس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اصلاح پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا

ارتقاء ہوتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہے گا۔ نادانانہ لوگ اس کو جاننے بغیر ہزار قسم کے دوسروں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تائید پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر تنگ دامن کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ الزام و حشت

دوسرا اعتراض، جو ملک میں تو بدی زبان سے مگر خبی معلولوں میں بڑی کافرانہ جھادوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرونِ وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنہیں اس ہندوب دود کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور دُڑے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔ یہ اعتراض سن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو بھی جاتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاؤں دامان کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھو ذرا پسند قبا دیکھو

جس دود میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہیے۔ آج کا نام نہاد ہندوب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثالی تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک دود میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار نہیں ہم بار کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں لٹا، جسم کے پورے اڑا دیتا ہے۔ دُڑے برساتے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مرنے لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صلب بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامہ عظیم اور غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو سیاسی مجرم یا جاسوس، یا خفیہ کمانڈر، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کون سی کسراٹھا رکھتا ہے۔ ثبوتِ مجرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اس کا اقبالِ مجرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی

ہند ب حکومتوں میں اختیار کیے جا رہے ہیں وہ کس سے چُپے ہوتے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ کج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کرتے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ حاصل اخلاقی قسمل میں ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں ان پر تو وہ خوب عذاب دیتے ہیں وہ دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے حرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بے خودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو دیکھنا، سرنش اور ملامت بھی انہیں ناگوار ہوتی ہے اور حرم نہ سمجھنے کی صورت میں لا محالہ وہ ناگوار خاطر ہوتی ہی چاہیے۔

اب میں ان معترضین سے پرہیزتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قسمل کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی حدیں؟ یا موجودہ ہندو مذہب کی؟ اگر آپ کی تقدیریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و عذاب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کیے تھے اور وہ سرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لیے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گنجشک چھڑیں۔ آپ کا مقام ہند نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بناتی ہے، کوئی ادنام اپنے لیے تجویز کیجئے، اور صاف صاف کہیے کہ ہم اسلام کو بحیثیت دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی منازقں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں اس پر ایمان لانے کا آخر کس الحق نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور کون الحق یہ باور کر سکتا ہے کہ اُس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد بھی آپ اُس کے مومن ہیں۔

۴۔ فقہی اختلافات کا بہانہ

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جڑا ہے۔ اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا۔

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی آمیدیوں لگاتے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ نکال کر وہ اسلام کے "خطرے سے" کو نکال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائے گا۔ حالانکہ درحقیقت، سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف ذروں میں ابتداء سے آج تک یکساں مسلم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ یہی اختلافات جتنے بھی ہوتے ہیں، تعبیرات میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۃ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوتے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استفسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اسی وقت بنتا ہے جب کہ اُس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہاء جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ الاجماع یا علیہ المجملوہ اور علیہ الفتویٰ، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے کی بنا پر اب قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام اُمت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے یا دینیات اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے۔ دوسرے وہ جن پر کسی وقت کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انہیں قبول کر لے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں تمام مسلمانوں کو

بیشیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائیں گے۔

یہ بیشیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے۔ دہا اُتدہ کا معاملہ، تو آگے آنے والے معاملات میں حکم خدا اور رسولؐ کی جس تعبیر یا جس قیاس و اجتہاد میں مستحسان پر ہمارے ملک کے اصحابِ عقل و عقد کا اجماع ہو جائے گا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کرے گی وہ ہمارے ملک کے لیے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاویٰ پر مشتمل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلم ہوئے تھے۔ اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا ملک کی صورت جو تیزی کی جا سکتی ہے۔

اب دہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں گے ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل اقل گروہ پر سنل لاکے تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے۔ لیکن قانونِ ملک (Law of the Land) بہر حال وہی ہوگا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو اکثریت کے ملک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر مستقول بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ چونکہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں اس لیے یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے۔ اسلام میں اختلاف کر کے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی پیہودہ بات ہے جو چند کفرانہ افراد کو چاہے کتنی ہی پسند ہو بہر حال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ

آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے غیر مسلم بھی آباد ہیں، وہ کس طرح یہ گوارا کر لیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مستطہ ہو جائے؟ یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لیے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔

حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سمجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانونِ ملکی ہے نہ کہ قانونِ شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مُسَلَّم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمہ کو دیا تھا، بلکہ وہ حقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دود کے اہل قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق یکساں ہے اور یہ محول معلوم کیلئے کہ جس دینا ست کی آبادی مختلف المذہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مستط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانونِ ملکی کونسا ہو؟ انصاف کی دوسرے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانونِ ملکی وہی ہونا چاہیے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اُس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لیے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے با مقول جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق نہیں سمجھتے؟ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ بن گئے ہیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ اختیار ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مُرتد ہو رہے ہیں۔ کیا فی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کریں؟ کیا کوئی اقلیت کسی با اختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی مقبول اصول ہے

کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں صوبہ کو لائسنس ہی ہو کر رہنا چاہیے، اگر
 ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک
 میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

(ترجمان اہل حق - جولائی ۱۹۴۸ء)

پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟

ذیقبر ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء کو لاہور میں کی گئی تھی۔

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تفسیر پر اس موضوع پر کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے اور ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں، اور وہ شبہات کیا ذہن رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریریں ایک تمدنی تقریر تھی۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اب ہم اس ملک میں اسلامی قانون کو از سر نو جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی ہوں گی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب

اس سلسلہ میں سب سے پہلے میں مزید سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو اسلامی قانون کے جرائم کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ لوگ جب سُنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہو گا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظام حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت

مفسوخ ہو جائیں گے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کر دیا جائے گا۔ یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے مذہبی طبقے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ اُن کے نزدیک ایسا ہونا چاہیے کہ اصرار اسلامی حکومت قائم ہو اور اُدھر خود ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قانون کا نفاذ شروع ہو جائے۔ درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظام زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اس کے قانونی نظام کا بدل جانا ناممکن نہیں ہے۔ انہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو برس سے ہم پر جو انگریزی اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلا دیا ہے ادا اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ عملی مسائل میں بصیرت نہیں رکھتے، اس لیے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور تحصیل پر مسرعوں جمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ پھر اُن کی یہی باتیں اُن لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فراڈ کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں، یہ موقع دے دیتی ہیں کہ وہ اس تسخیل کا مذاق اڑائیں اور اس کے حامیوں کا استخفاف کریں۔

تذریع کا اصول

اگر ہم فی الواقع اپنے اس تسخیل کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اُمل قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں بتدریج ہی ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یک رُخا ہوگا اتنا ہی وہ ناپائدار ہوگا۔ ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو میں پورے توازن کے ساتھ کار فرما ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشہ کو سہارا دے سکے۔

عہد نبوی کی مثال

اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو شخص حضورؐ کے کارنامے سے متوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ آپؐ نے

پورا اسلامی قانون اس کے سامنے شعبوں کے ساتھ ایک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لیے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ سابق جاہلیت کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کیے تھے۔ آپؐ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپؐ تربیت دے کر ایک ایسا مصالح گردہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن اور ادویہ نظر اور طریقہ عمل خالص اسلامی تھا۔ جب یہ کام ایک خاص حد تک پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپؐ نے دوسرا قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے۔ اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لیے آپؐ پہلے مرنے و دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے کوشش فرما رہے تھے۔ آپؐ نے ایک مرتبہ اللہ منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدینے کی جدوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی افکار کی۔ بُرائی رسموں اور طوطیوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کیے۔ اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعہ سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا، آپؐ اسی کے مطابق پورے تواریخ اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ سال کے اندر ایک طرے اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔

قرآن اور حدیث کے فائز مطالعے سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپؐ نے یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ حراشت کا قانون ۳ ہجری میں جاری کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ہجری میں مکمل ہوئے۔ فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کر کے نافذ کیے جاتے رہے یہاں تک کہ ہجری میں ان کی تکمیل ہوئی۔ شراب کی بندش کے لیے بتدریج خنایاں کی گئی اور ہجری میں اس کا قطعاً انسداد کر دیا گیا۔ عود کی بُرائی اگرچہ

کہہ ہی میں عمارت عمارت بیان کی جا چکی تھی، مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے ایک نکتہ بند نہیں کر دیا گیا، بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب تک سے ماہیوں میں ڈھال یا گیا تب کہیں سہہ بھری میں سود کی قلعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک عمارت کا سلام تھا جس نے اپنے پیش نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لیے لاریگر اور مزدور جمع کیے، ذرائع و وسائل ہتیا کیے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا ہوا اور پر تک لے گیا، اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل ہوئی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

انگریزی دور کی مثال

قریب کے زمانہ میں خود ہمارے ملک پر عرب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو کب انہوں نے ایک نکتہ یہاں کا سارا نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں۔ ان کی حکومت سے پہلے چھ سات سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی فقہ پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی بھی ہماری عمارت کو ڈھادینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاہم یہ سب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہندوستان میں اسلامی فقہی رویہ رہا۔ عدالتوں میں قاضی ہی انصاف کے لیے بیٹھتے تھے اور اسلام کا قانون صرف پرشلہ کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ وہی علی ستانوں (Law of the Land) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلتے بدلتے ایک صدی لگ گئی۔ انہوں نے بتدریج یہاں کا نظام بدل کر اپنے مطلب کے آدمی ڈھالے، اپنے خیالات کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں، اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے، اپنی بالادستی کے زور سے معاشی نظام بدلا اور ہر جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہر گیر اثرات یہاں کی اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے

اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بھی انگریزی حکومت

کے صد سالہ نقوش کو کھریچ دینا اور نئے نقوش ثبت کر دینا محض ایک جُنبشِ قلم سے ممکن نہیں ہے۔ ہمارا پُرانا نظامِ تعلیم زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ایک مدتِ دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے خارجِ تحصیل لوگوں میں ایک فی ہزار کے اوسط سے بھی ایسے آدمی نہیں نکل سکتے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج اور جسٹریٹ بنائے جاسکیں۔

دوسری طرف موجودہ نظامِ تعلیم نے جو آدمی تیار کیے ہیں وہ اسلامِ اداکس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان میں ایسے آزاد بھی خال خال ہی پاتے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اس تعلیم کے زیرِ طبعی اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر سوڈیٹر سو برس تک معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے اچھا خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دور کی عدالتی ضروریات کے لیے کارآمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی اثر سے آزاد اور انگریزی حکومت کے تابع رہتے رہتے ہمارے اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور ریاست کا نقشہ اصل اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔

اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو یک لخت بدل دینا۔۔۔ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو۔۔۔

تفہیم بخیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ باہم متضاد ہوں گے، اور ایسے قانونی تغیر کا وہی حشر ہو گا جو ایک پودے کو ایسی آب دہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہذا یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدبیر کے ساتھ ہو، اور قانونی تبدیلیاں اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقہ سے کی جائیں۔

ایک غلط پہانہ

لیکن تدبیر کے اس معقول اور سچے خود بالکل صحیح اصول کو پہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرِ دست تو یہاں ایک غیر دینی۔۔۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین۔۔۔ ریاست ہی قائم ہونی چاہیے، پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائے گا تو وہ اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائے گی جو اسلامی قانون جاری کر سکے، وہ سرِ امر ایک

نامعقول بات کہتے ہیں۔ میں ان سے پرچتا ہوں کہ یہ ماحول تیار کون کرے گا؟ کیا ایک بے دین ریاست جس کی بائیس فرنگیت زرہ حکام اور لیٹروں کے ہاتھ میں ہوں؟ کیا وہ مہاراجہ صرف مینانہ و جیم خانہ ہی کی تعمیر جانتے اور اسی سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں ایک مسجد تعمیر کرنے کا سامان کریں گے؟ اگر ان لوگوں کا یہی مطلب ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہو گا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لیے تیار کرے گی۔ اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا اس کی صاف صاف توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون، کس طاقت اور کن ذرائع سے کریگا؟ اور اس دوران میں خود بے دین ریاست اپنے ذرائع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر و ترقی میں صرف کر رہی ہے؟

ابھی ابھی تدریج کا اصول ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں انہیں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیں تو آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نظام زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی نظام زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو تدریج ہی ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک مہاراجہ طاقت، اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ مسلسل اُس کے لیے کام کرے۔ صدر اقل میں جو اسلامی انقلاب ہوا تھا اسی طرح ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں اس کے لیے موزوں آدمی تیار کیے، تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کے خیالات بدلے، حکومت کے پردے سے نظم و نسق کو معاشرے کی اصلاح اور ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لیے استعمال کیا، اور اس طرح وہ ماحول بنا جس میں اسلامی قانون جاری ہو سکا۔ ماضی قریب میں انگریزوں نے ہندوستان کے نظام زندگی میں جو تغیرات کیے وہ بھی تو اسی طرز پر ہوئے کہ زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس تغیر کے خواہش مند تھے اور اس کے لیے کام کرنا جانتے تھے۔ انہوں نے ایک مقصد اور ایک نقشہ کو نگاہ میں رکھ کر پہم اس تغیر کے لیے کوشش کی اور آخر کار یہاں کے پردے نظام زندگی کو اُس سانچے میں ڈھال کر ہی چھوڑا جو ان کے اصول و قوانین سے مناسبت رکھتا تھا۔ پھر کیا اب ہماری پیش نظر تعمیر اُس مہاراجہ طاقت کے بغیر ہو جائے گی؟ یا ایسے مہاراجوں کے ہاتھوں ہو سکے گی جو اس نقشے پر تعمیر کا کام نہ جانتے ہوں اور نہ چاہتے ہوں؟

صحیح ترتیب کار

میں سمجھتا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ ہر معقول آدمی اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جب پاکستان اسلام کے نام سے اور اسلام کے لیے مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیے جو اسلامی زندگی کی تعمیر کرے۔ اور جب کہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لیے کہیں اور سے معارف فراہم کریں۔

پہلا قدم

یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اس ریاست کو، جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں۔ اور اسے مسلمان بنانے کی آئینی صورت یہ ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:۔

۱۔ پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

۲۔ ریاست کا اساسی قانون شریعت خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی ہے۔

۳۔ تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جاسکے گا جو شریعت سے متصادم ہوتا ہو۔

۴۔ ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہ وہ کلمہ شہادت ہے جسے اپنی آئینی زبان ————— یعنی دستور ساز اسمبلی ————— کے ذریعہ سے ادا کر کے ہماری ریاست مسلمان ہو جائے گی۔

دوسرا قدم

اس اعلان کے بعد ہی صحیح طور پر چارے راستے ہر مندوں کو یہ معلوم ہو گا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لیے اپنے نامندے منتخب کرنے ہیں۔ عوام میں علم و دانش کی لاکھ کچی سہی، مگر وہ اتنی

مجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں کس کام کے لیے کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کے درمیان کون لوگ کس مطلب کے لیے موزوں ہیں۔ آخر وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ علاج کے لیے دیکھ اور مقدمہ لڑنے کے لیے ڈاکٹر کو تلاش کریں۔ وہ اس کو بھی کسی نہ کسی حد تک جانتے ہی ہیں کہ ان کی بیٹیوں میں ایمان دار اور خدا ترس کون ہیں، چالاک اور دنیا پرست کون، اور شریر و مفسد کون۔ جیسا مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ اس کے لیے اپنے اندر سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اب تک ان کے سامنے یہ مقصد آیا ہی نہ تھا کہ انہیں ایک دینی نظام چلانے کے لیے آدمی درکار ہیں۔ پھر وہ اس کے چلانے والے آخر تلاش کرتے ہی کیوں؟ جیسا بے دین اور غیر اخلاقی نظام ملک میں قائم تھا اور اس کا مزاج جس قسم کے آدمی چاہتا تھا، اس کے لیے ویسے ہی آدمیوں پر لوگوں کی نگاہ انتخاب پڑی اور انہی کو رائے دہندوں نے چن کر بیج دیا۔ اب اگر ہم ایک اسلامی ریاست کا دستور بنائیں اور لوگوں کے سامنے سوال یہ اُجائے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے انہیں موزوں آدمی منتخب کرنے ہیں، تو چاہے ان کا انتخاب کمال درجہ کا معیار ہی نہ ہو، مگر بہر حال اس کام کے لیے ان کی نگاہیں نفاق و نجا اور دین و مہربانی کے مومنین پر نہیں پڑیں گی۔ وہ اس کے لیے انہی لوگوں کو تلاش کریں گے جو اخلاقی، ذہنی اور علمی حیثیت سے اس کے اہل ہوں گے۔

پس ریاست کو مسلمان بنانے کے بعد تعمیرِ ریاست اسلامی کی راہ میں دو سرِ اقدام یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعے سے اس ریاست کی تمام کارِ سیسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظامِ زندگی کو ڈھانا چاہتے بھی ہوں۔

تیسرا قدم

اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ (Plan) بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لیے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کیے جائیں۔ تعلیم کا نظام بدرا جائے۔ ریڈیو، پریس، سینما اور خطابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں۔ معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھلنے کے لیے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے۔ سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج ان لوگوں کو خارج کیا جائے جو پرانے فاسقانہ و کافرانہ نظام کی عادات و

خصائل میں ڈھل کر سوکھ چکے ہیں، اور ان نئے عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں۔ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جاتیں اور اس کا پورا ڈھانچہ جو پرانی ہندوستان اور جدید فرنگستان بنیادوں پر چل رہا ہے، اُدھیر ڈالا جلتے۔ یس یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پوشے نظم و نسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کر دے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدلا جاسکتا ہے، اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جاتے ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں باقی نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے باز نہ جائے۔

اجراء قانون اسلامی کے لیے تعمیری کام

اب میں خاص طور پر اس تعمیری کام کی کچھ تفصیل آپ سے بیان کروں گا جو ملک کے قانونی نظام کو بدلنے اور اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کے لیے ہمیں کرنا ہو گا۔ جس اصلاحی پروگرام کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں اس کے سلسلہ میں ہم کو قریب قریب ہر شعبہ زندگی میں بہت سے تعمیری کام کرنے پڑیں گے، کیونکہ مدت ہائے دراز کے تعطل، انحطاط اور غلامی نے ہمارے تمدن کی عماد کے ہر گوشے کو خراب کر کے چھوڑا ہے۔ لیکن اس وقت میری تقریر ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لیے دوسرے گوشوں کے تعمیری کام سے قطع نظر کر کے یہاں میں صرف اس کام کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو ہمیں قانون کے سلسلے میں کرنا ہے۔

ایک قانونی اکیڈمی کا قیام

اس پہلو میں اولین کام جو ہمیں کرنا چاہیے، یہ ہے کہ ایک قانونی اکیڈمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اساتذہ اس سے پہلے کر چکے ہیں، اور ان ضروری کتابوں کو جو فقہ اسلامی کی واقفیت کے لیے ناگزیر ہیں، اور زبان میں صرف متعلقی ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کو زمانہ حال کے طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کر دے تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فقہ کا اصل ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ

بالموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے، اور کچھ معنی سنائی باتوں کی بنا پر ہمارے پڑھے لکھے لوگ مومن اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ دُور انکار، لاطائف اختلافی بحثوں کے اس دفتر بے معنی کو دریا بُرد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کے کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اہل خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض اپنے علم ہی کی کمی کا نہیں فکر و تدبیر کے فقدان کا بھی راز ناش کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنی ان باتوں پر خود ہی شرم آنے لگے گی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فغول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ بہت سی ابتدائی منزلیں ہمارے لیے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی ہوئی عمارت کو خواہ مخواہ ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لیے عقل مندی یہی ہے کہ جو اگلے بنا گئے ہیں اسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لیے کارآمد بنائیں، اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آئے اس کے لیے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پیرتی ہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھی۔ اُس زمانے میں مسلمان زری گھاس نہیں کھودتے تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری ہی ضروریات پر ان کے فقہانے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ یہی فقہا ان حکومتوں کے جج، مجسٹریٹ اور جیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب ہر شعبہ قانون سے بحث کی ہے۔ محض دیوانی و زرداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون دان آدمی ان کی شرافت نگاہی کی داد دیتے بغیر نہیں

رہ سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اہل علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں، اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کارآمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اس ذخیرے میں ملی سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں جن کو اردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ احکام القرآن پر تین کتابیں، جصاص، ابن العربی اور قسطلانی۔

ان کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلبہ کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثار صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمہ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں ان کے دلائل سمیت منقول بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا قیمتی ذخیرہ کتب حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اردو میں منتقل ہونی چاہئیں۔

فتح الباری اور حسنی	بخاری پر
نوری اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فتح الملہم۔	مسلم پر
عون المعبود اور بذل الجہود۔	ابوداؤد پر
شاہ ولی اللہ صاحب کی مسودی اور مصنفی اور موجودہ دور کے	بروطا پر
ایک ہندوستانی عالم کی اوجز المسالک	
شوکانی کی نیل الاوطار	منتقى الاخبار پر
مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح۔	مشکوٰۃ پر
امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔	علم الآثار میں
۳۔ اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیے جو اس علم میں اہمات کتب	
کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں منتقل ہونی چاہئیں۔	

امام مرقسی کی المبسوط اور شرح السیر الکبیر۔ کاسانی کی بدائع
الصنائع۔ ابن ہمام کی فتح القدیر مع ہدایہ۔ اور فتاویٰ
عالمگیری۔

فقہ حنفی پر

کتاب الام۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج۔
المدوّنہ اور کوئی اہم کتاب جس کا اہل علم انتخاب کریں۔
ابن قدامہ کی المغنی
ابن حزم کی المحلی

فقہ شافعی پر

فقہ مالکی پر

فقہ حنبلی پر

فقہ ظاہری پر

مذاہب اربعہ پر

ابن رشد کی حایۃ المجتہد۔ اور علماء مصر کی مرتب کردہ
الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ نیز ابن القیم کی زاد المعاد
میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں۔
امام ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم کی الخراج۔
ابو عبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام
الوقف۔ و میاطی کی احکام الموارثت۔

مخصوص مسائل پر

۴۔ پھر میں اصول قانون اور حکمت تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا لینا چاہیے
تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہل قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت
پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابل انتخاب ہیں۔

ابن حزم کی اصول الاحکام۔ علامہ آیدری کی الاحکام لا محمول الاحکام۔ خضریٰ کی اصول
الفقہ۔ شاطبی کی الموافقات۔ ابن القسیم کی اعلام الموقعین۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی
حجتہ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان
میں کر ڈالے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سر نو مرتب
بھی کرنا ہوگا، نئے نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت
جمع کرنا ہوگا۔ فہرستیں بنانی پڑیں گی اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے۔ اس محنت کے بغیر یہ

کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد نہ ہو سکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریق تدوین کچھ اور تھا اور اُس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد، امارت اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہی مجموعہ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔ اس سلسلہ کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب العرف، کتاب المضاربہ، اور کتاب المزارع وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانون شہادت، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری، اور ضابطہ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعوی، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادت اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جوں کی توں اردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کما حقہ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظریہ رکھنے والے اہل علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں۔ اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے تو کم از کم اتنا ضروری ہی ہونا چاہیے کہ ان کی نہرستیں پوری باریک بینی کے ساتھ بنائی جائیں اور مختلف قسم کے انڈیکس بنا دیئے جائیں جن کے ذریعہ سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوین احکام

اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذمہ دار علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید و جدید کی کتب قانون کے طرز پر مدون (Codify) کر دے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی

نقطہ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے۔

- ۱۔ کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔
- ۲۔ کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

- ۳۔ کوئی استنباط، تیس، اجتہاد یا استحسان جس پر اُمت کا اجماع ہو، یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔
- ۴۔ اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اس اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلہ احکام (Code) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو قوانین آئندہ اجماعی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلہ احکام بن جائے تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شرح (Commentary) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور لاکالوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لاکالوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درس گاہوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطہ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین

کے اجراء کے لیے مزدور ترین، مگر قانون اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔
اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درس گاہوں میں اپنے معیار کے فقیہ پیدا
کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں
قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لیے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔
دوسرے اہل علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تاکہ ایک اچھی قابل عمل
اسکیم بن سکے۔

۱۔ سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیے کہ آئندہ سے لاکالہجوں میں داخلہ کے لیے عربی
زبان کی واقفیت ————— آسنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے
کافی ہو۔ ————— لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے
ہیں، اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے
باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت
بہر حال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اُس زبان سے واقف نہ ہو جس
میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً
ہمیں لاکالہجوں کے لیے عربی داں اُمیدوار فراہم کرنے میں دشواری مزید پیش آئے گی۔ ممکن
ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر کالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کیلئے کھولنی
پڑے، اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے۔ لیکن اُس کے
چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی
تو کالج میں داخلہ کے لیے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف
ہوں گے۔

۲۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے
طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح
سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درس گاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے

کہ تعلیم کی ابتداء فقہ سے کی جاتی ہے، پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطہ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں، بلکہ ان میں بھی کلام الہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان درس گاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نا بلند رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذاہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائل زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بار بار شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداء چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گر بجوئیٹ نہ مل سکیں گے، اور اس کے لیے شاید ہمیں لاکھوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن اگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جاسکے گا کہ لاکھوں میں صرف وہی طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بیٹھے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہو گا۔

۳۔ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصول قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ۔ دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے نہ ان کے اندر وہ

جہادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر سیاست کی روز افزوں ضروریات کے لیے تعمیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقہ استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر اخروہ روز منت منتے پیش آنے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جاننے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہو گا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقہ پر ہوا ہے، اور آئندہ کس طریقہ پر ہو سکتا ہے فقہائے اسلام کے جمع کیے ہوئے پوسے ذخیرے پر دینے نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب کے رہنما کی نہ ملتی ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کر لیں۔ انہی وجوہ سے ہمیں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴۔ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لاکالوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہو گا۔ اسلامی نقطہ نظر سے لاکالچ چاہاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جاسکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اس مسئلہ کے لیے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شرع، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتوے دیتے وقت یا کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں۔ کوئی دُپٹ، کوئی خوت، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت ان کو اس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں۔

(ترجمان القرآن - اگست ۱۹۴۸ء)

ملہ تقریر کے آخری حصے کی تفصیلات یہاں حذف کر دی گئی ہیں۔ پوری تقریر کتابی شکل میں شائع

شده موجود ہے۔ (جدید)

مطالبہ نظام اسلامی

یہ ان تقریروں کا مجموعی خلاصہ ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی (جہاں ایسر حکومت پاکستان) نے اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعت اسلامی کے عام اجتماعات میں فرمائی تھیں۔ ان تقریروں کو جن ہزاروں مسلمانوں نے سنا ان کو پہلی مرتبہ واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ حصول پاکستان پر ان کا کام ختم نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اہل نصب و تعیین کی طرف قدم بڑھانے کا توا بھی آغاز ہی ہوا ہے۔ اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی مزید محنت و ایثار کی ضرورت ہے۔

اس تقریر کو مرتب کرنے کا وقت نکالنے سے پہلے مولانا نے محرم ۱۴۲۰ھ کو ۱۹۴۸ء کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن ادھر چونکہ اس تقریر کی اشاعت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور مولانا کی رہائی میں ابھی دیر ہے اس لیے مجبوراً اخبارات کی مدد سے اسے ہم بطور خود

ملے یہ تقریر ۱۹۴۹ء کے آغاز ہی میں پینلٹ کی صورت میں شائع ہو گئی تھی۔ ترجمان القرآن میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ (جدید)

مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔

ناظم مکتبہ جماعت اسلامی

بعد از حمد و ثنا:

ہم دور اسے پر کھڑے ہیں

حاضرین و حضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گزر رہے ہیں، ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دور اسے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو در راستہ کھلے ہوئے ہیں، اُن میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ ہمیشہ قوم ہم کریں گے وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم اُن اصولوں پر اپنے نظام زندگی کی بنیاد ہی کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ ہماری ساری کی ساری زندگی ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست غرض سب کچھ اُن اصولوں پر استوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے نظام زندگی کو قبول کر لیں۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظام زندگی۔

اگر خدا نخواستہ ہم نے دوسرے راستے کو پسند کیا تو ہم اپنے اسلام کی ہمیشہ قوم نفی کریں گے اور اپنے اُن تمام اعلانات سے معرفت ہوں گے جو ایک مدت سے ہم خدا و خلق دونوں کے سامنے کرتے رہے ہیں اور اس اجتماعی وعدہ خلافی کی وجہ سے خدا و خلق دونوں کے سامنے ہمیں رسوا ہونا پڑے گا۔ پھر اس راستے پر چلنے کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ ہو گا کہ برصغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا قطعی خاتمہ ہو جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم پہلا راستہ انتخاب کریں اور خالص اسلامی اصولوں پر اپنی قومی زندگی کو قائم کریں تو ہم دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی ہمارے لیے کامیابی ہوگی، ہم خدا کے حضور بھی شہر خرو ہوں گے اور خلق کے سامنے بھی ہمارا وقار قائم ہو سکے گا۔ ہم اسلامی نظام زندگی کے علمبردار بن کر پھر اُسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جس پر ہزاروں برس پہلے جب ایک قوم کھڑی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُسے

مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا کہ "اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ" ! یعنی ہم نے تمہیں دنیا کی ساری اقوام پر فضیلت عطا کی۔ پھر اس کے بعد جب اسی مقامِ عظمت پر ایک دوسری قوم کھڑی ہوتی تو اسے کہا گیا "کُنْتُ خَیْرَ اُمَّةٍ" اور "کُنَّا لَکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" یعنی تم بہترین امت ہو اور تمہیں مرکزی امت بنایا گیا ہے۔

ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا

بہر حال آج یہ دونوں مواقع ہم سے ملنے میں اصال میں سے جس کا بھی ہم انتخاب کریں گے، اس کا اثر مدت ہائے دراز تک ہماری قسموں اور ہماری آئندہ نسلوں کی قسمتوں پر پڑے گا۔ اس موقع پر اگر ہم اسلام کے اصولوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور اپنے نظامِ حکومت کی تشکیل اسلام کے نقشے پر کرتے ہیں تو یہ کئی وجوہ سے درست ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا عین تقاضا یہی ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی خدا کا طبع ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خود مختاری اور آزادی کو خدا کے حق میں تسلیم (Surrender) کر دیا جائے اور اقرار کر لیا جائے کہ اب میں جو زندگی بسر کروں گا، خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود اور ضابطوں کے اندر بسر کروں گا، اس کی طرف سے ہر بڑھنے کا اشارہ ہوگا اور ہر بڑھوں گا، اور ہر سے ٹک جانے کا حکم ہوگا اور ہر سے ٹک جاؤں گا۔ جس طرح ایک فرد اپنے خدا سے یہ عہد باندھ کر جب اپنی زندگی کو اس کی رضا کے تابع کر دیتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کے مسلمان ہونے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی آزادی و خود مختاری سے اللہ تعالیٰ کے حق میں دست بردار ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے حدود و قوانین کا پابند بنا لے۔ یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی اپنی جگہ مسلم ہو، لیکن جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔ اگر مجموعہ غیر مسلم ہو تو افراد کس طرح مسلم ہو سکتے ہیں؟ اور اگر افراد مسلم ہوں تو ان کا مجموعہ غیر مسلم کیوں ہو؟ افراد اگر مسلمان ہوں اور مسلمان رہنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے لازم ہے کہ وہ جب مل کر ایک قوم اور ایک اسٹیٹ کی شکل اختیار کریں تو وہ قوم اور اسٹیٹ ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں۔

پاکستان برائے اسلام

پھر ہمارے مطالبہ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بحیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطہ زمین ایسا ملنا چاہیے جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کو از سر نو قائم کر سکیں، اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں کیونکہ ایک غیر مسلم اکثریت کے تحت ہمارے لیے اس طرح کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب سے ڈیڑھ سال پہلے تک اس امر کے کوئی آثار نہ تھے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے گا اور یہاں مسلمانوں کی ایک آزاد سلطنت قائم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جو لوگ اُسکے چل رہے تھے اور اس مطالبے کی جدوجہد میں قیادت کا فرض ادا کر رہے تھے، خود ان کو بھی اس بات کا قطعی یقین نہ تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حالات جس طرح بدلے اور پاکستان کے قیام کے لیے جس طرح فضا سازگار ہوئی اور ملک آٹا ناٹا تقسیم ہو گیا، اس کی آپ جو چاہیں عقلی توجہ ہیں کریں، لیکن میں اس انقلاب میں اردو، الہی کو خاص طور پر شامل پاتا ہوں۔ واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد تاریخ میں یہ بات پیش آئی ہے کہ ایک قوم نے کھڑے ہو کر بحیثیت قوم یہ کہا کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اور چونکہ غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں ہمارے لیے اس کا امکان نہیں ہے لہذا ہمیں ایک آزاد خطہ زمین ملنا چاہیے، اگر ہمیں یہ آزاد خطہ مل جائے تو اس میں ہم پورے کے پورے اسلام کو غالب کریں گے۔ خدا کے ہاں یہ بات مقبول ہوتی کہ جب یہ قوم کہتی ہے کہ ہم اسلامی نظام حیات کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ایک بار اسے اس کا موقع دینا چاہیے۔ ایک مدت سے آپ کو پامال کیا جا رہا تھا۔ لیکن آپ نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ پُکٹنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک نازک امتحان

آپ کو یہ موقع مل جاتا جس طرح فضل و رحمت ہے اسی طرح یہ آزمائش و امتحان بھی ہے۔ پاکستان مل جانے کے بعد آپ سب امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ اب آپ کا اس امر پر امتحان ہے کہ آپ پچھلے دس سال میں جو کچھ زبانوں سے کہتے رہے ہیں، کیا فی الواقع آپ کے دلوں میں

بھی وہی ہے؟ جن باتوں کو آپ اعلان کرتے رہے ہیں، کیا آپ کی نیتیں بھی انہی کے مطابق ہیں؟ خدا و خلق کے سامنے جو اقرار آپ نے کیے ہیں کیا وہ سچے اقرار تھے یا جھوٹے؟ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو چرچا آپ نے کیا تھا، کیا وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا یا اب صدقِ دل سے آپ اپنی زبان سے نکالی ہوئی بات پر عمل کر کے دکھاتے ہیں؟ آپ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ۔ آپ کہتے تھے کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام پر پوری طرح عمل کر سکیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر آپ کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے تھے یا جھوٹے؟

اسلام کے حفظ و بقا کی واحد صورت

تیسری بات جس کی وجہ سے یہ فیصلہ اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہ بہت زیادہ دردناک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب نے جو پچھلے سال ہوتا ہے ہمیں ایک نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہندوستان کا ایک اچھا خاصا بڑا حصہ اسلام سے اور اسلام کا نام لینے والوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ جس خطے نے کبھی شاہِ دل اللہ اور مجددِ ملت ثانی رحمہم اللہ کو جنم دیا تھا، آج وہاں اذان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہاں نہ کوئی اذان دینے والا رہا ہے، نہ کوئی اس کا سننے والا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے باقی حصہ میں بھی اسلام بے وردی کے ساتھ مٹا یا جا رہا ہے۔ اب وہاں صورتِ حالات یہ ہے کہ ریل میں سفر کرتے ہوئے یہ پہچاننا مشکل ہے کہ مسافروں میں مسلمان کون ہے۔ بہت سے لوگ جو کل تک اسلام اسلام پکارتے تھے، آج وہ اسلام سے توبہ کر رہے ہیں۔ اب وہاں اگر کوئی مسلمان رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس میں اسلام کی بُو بھی باقی نہیں ہے۔ اگر یہی رخصت رہی تو آئندہ چند برسوں میں مسلمان کا وجود ہندوستان میں عنقا ہو جائے گا۔ ہمارے اساتذہ نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی لگاتار کوششوں سے پھیلا یا تھا وہ اب آٹھ سو سال کے بعد پاکستان کے دو خطوں میں سُکڑ کر رہ گیا ہے۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا۔ اس بڑے عظیم ہند کے تین چوتھائی حصے سے تو اسلام دوسروں کے مٹانے سے مرٹ رہا ہے۔

یہاں یہ ہمارے اپنے مٹاتے مٹے گا۔ اس لیے اب ہمیں اگلا قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔
اب صرف ایک ٹھوکر ہمارے اور اسلام کے مٹنے میں کافی ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر ٹھوکر کھائی
تو ہمارے اسلام کے دینی کارنامے کی ساری تاریخِ حروف غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ یہ سب
وجہ اس امر کے داعی ہیں کہ ہم فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اس ملک کے نظام کو بہر حال اسلامی بنیادوں
پر اٹھانا ہے اور یہاں ہمارے ہاتھوں سے سیاست و تمدن کا جو نقشہ بنے گا وہ اسلام کے منشا
کے مطابق ہی بنے گا۔

موجودہ نظام کو مسلمان بنانے کا طریقہ

اس مسئلہ پر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس نظام کو جو یہاں اب تک چل رہا ہے مسلمان بنانے
کا طریقہ کیا ہے؟ کسی نظام کے مسلمان ہونے کا نظری طریقہ بالکل وہی ہے جو ایک فرد کے
مسلمان ہونے کے لیے مقرر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم فرد کو مسلمان بنانے کے لیے
ہم یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس کی ظاہری شکل و صورت اور لباس میں کچھ تبدیلیاں کرادی جائیں
اور اسے کہا جاتے کہ اپنے کھانے پینے کی فہرست میں سے بعض چیزوں کو نکال دو اور اپنی عادات
میں چند تبدیلیاں کر لو۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا جائے کہ جاؤ اب تم آہستہ آہستہ مسلمان بن جاؤ گے۔
پھر کچھ مدت کے بعد جب وہ غیر مسلم فرد اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں کر چکے تو آخر میں اسے
کلمہ پڑھایا جائے؟ — نہیں ہم ایسا نہیں کرتے، بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہونا چاہتا ہے
تو سب سے پہلے اسے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور جب وہ کلمہ پڑھ کے یہ اقرار کر لیتا ہے کہ اب
اسے اپنی زندگی خدا کی بندگی اور عہدہ علی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بسر کرنی ہے تو پھر ہم
اسے ایک ایک کر کے دین کے احکام بتاتے ہیں اور اس کے اعمال و افعال اور اس کی عادات و
اطوار میں تبدیلیاں کراتے ہیں۔ ٹھیک یہی طریقہ ایک نظامِ حکومت اور نظامِ ملکی کو بھی مسلمان
بنانے کا ہے کہ پہلے اس سے چند بنیادی اصول منوائے جاتے ہیں اور پھر جب وہ ان
اصولوں کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس کے سامنے اسلام کے عملی مطالبات تدبیراً رکھے جاتے ہیں اور
اس میں وہ ساری تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جو دین کو مطلوب ہیں۔

ہمارے ملک کا نظام اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر قائم ہے جسے

انگریز نے اپنے اصول و مقاصد کے مطابق بنایا تھا۔ انگریز کی حکومت اسلام کی حکومت نہیں تھی،
 گفر کی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی وہی نظام حکومت اب تک قائم ہے۔ اگرچہ اسے مسلمان
 چلا رہے ہیں لیکن یہ نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے کافرانہ ہی ہے۔ اب اس نظام کو مسلمان بنانے
 کے لیے اگر کوئی بنیادی تبدیلی سبک پہلے کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس طرح فرد کو مسلمان
 بنانے کے لیے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی کلمہ پڑھایا جائے۔ ایک حکومت کو کلمہ
 پڑھانے کے لیے جو دستوری طریقہ ہو سکتا ہے اسے ہم نے ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کیا
 ہے۔ میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں اور پھر اس کی تشریح کروں گا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس
 اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے پہلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس کے مطابق کیا جدوجہد
 کی جانی چاہیئے!

دستوری "مطالبہ"

مذکورہ مطالبہ جو اس موقع پر پڑھ کر سنایا گیا، درج ذیل ہے:

۱۔ چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی
 ہے، اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف
 اسی خاطر تھیں کہ وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے
 ہیں،

لہذا

اب قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ
 وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی
 حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری
 کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں، منسوخ کیے

جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کی خلاف ورزی ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات اُن حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔“

اس مطالبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا چاہیے کہ جب کسی ملک کا دستور مرتب کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے بطور اصول موضوعہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ کن اصولوں کی مطابقت نظام بنانا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے ہندوستان کا دستور بن چکا ہے اور وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے ملک کی دستور ساز اسمبلی نے ایک قرارداد مقاصد پاس کر کے ان مقاصد (Objectives) کا تعین کیا ہے جن کے لیے وہاں کی حکومت کام کرے گی۔ بالکل اسی طرح پاکستان میں بھی دستور سازی کا پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ مقاصد کو طے کر لیا جائے۔ انہی مقاصد کو ہم نے دستوری زبان میں چار نکات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اب میں اس کی ایک ایک شق کی تشریح کرتا ہوں۔

پہلی شق کی تشریح :

خدا کی حاکمیت

سیاست اور دستور (Constitution) میں بنیادی سوال یہ ہوتا کرتا ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اگر حاکمیت کسی شخص یا کسی خاندان کے لیے مخصوص کی جاتی ہے تو پھر حکومت کی پوری مشینری اسی شخص یا خاندان کی مرضی کے گرد گھومتی ہے۔ اگر حاکمیت (Sovereignty) ملک کے عام باشندوں کی ہو اور مالک الملک خود ملک کے عوام ہوں تو پورا نظام باشندگان ملک کی مرضی کے گرد گھومتا ہے اور حکومت کے تمام ذرائع اور طاقتیں اس لیے استعمال ہوتی ہیں کہ ان مالکان ملک، یعنی عام لوگوں کے منشا کو پورا کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسی کو رکھا ہے۔ پاکستان کے باشندے چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے وہ مالک الملک نہیں ہو سکتے، اُن کے مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی حاکمیت اور آزادی سے خدا کے حق میں دست بردار ہو چکے ہیں۔ اب ان کا مقصد زندگی ہی یہ ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اُسی کے منشا کو پورا کریں۔

پس مسلمانوں کی قائم کی ہوئی حکومت بھی اُسی صورت میں مسلمان ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مالک الملک مان کر اس کی مرضی کو پورا کرنے کا فیصلہ کرے۔

بعض لوگوں نے اس مطالبہ کو یہ شکل دی ہے کہ حکومت یہ اعلان کرے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں، اس لیے کہ بہت سے ملک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دستور (Constitution) میں اپنی حکومت کا مذہب اسلام ہی قرار دے رکھا ہے، لیکن وہاں حاکمیت کسی فرد یا خاندان یا عام باشندگان ملک کی ہے۔۔۔۔۔ میں کسی ملک کا نام لینا نہیں چاہتا کیونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اور ہم کسی ہمسایہ ملک سے اپنے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے۔۔۔۔۔ بہر حال جب تک کوئی حکومت حاکمیت (Sovereignty) کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہ قرار دے لے، دستوری حیثیت سے وہ اسلامی حکومت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی دستور ساز اسمبلی سے پہلا مطالبہ اسی بات کا کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان لانے کا صاف صاف اعلان کرے۔

دوسری شق کی تشریح۔

پاکستان کا بنیادی قانون

دوسری شق پہلی شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ چونکہ مالک الملک خدا ہے اس لیے اُسی کی مرضی کو بنیادی قانون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس شق کو مان لینے کے بعد یہاں کی پارلیمنٹ کا حق قانون سازی محدود (Limited) ہو جاتا ہے اور ہماری اسمبلیوں کے اختیارات دوسری اسمبلیوں کی طرح غیر محدود نہیں رہتے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اسمبلیاں خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتیں، بلکہ اُن کے لیے دستوری طور پر لازم ہو جاتے گا کہ جو قوانین اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیئے ہیں، انہیں وہ جوں کا توں بے چون و چرا قبول کر لیں اور ان کو پاکستان کے بنیادی قانون کی حیثیت سے نافذ العمل کریں۔ رہے وہ احکام جن کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں، ان کی مختلف تعبیروں میں سے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنے کا حق ان لوگوں کو ہو گا جو کتاب و سنت کا علم اور فہم رکھتے ہوں۔ پھر جن امور کے متعلق خدا اور رسولؐ نے کوئی واضح احکام نہیں دیئے۔

وہاں واضح احکام نہ دے کر خدا اور رسولؐ نے خود یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں مسلمانوں کی جماعت آزاد ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق قواعد و ضوابط بناتے اور اس کام کے لیے مسلمان عوام پر حال ان لوگوں ہی کو متعین کر سکتے ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

تیسری شق کی تشریح :-

شرعیات اسلامی کا احیاء

یہ شق دوسری شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ جس شریعت کو منسوخ کر کے انگریز نے اپنے قوانین جاری کیے تھے اب وہی شریعت پھر نافذ ہونی چاہیے، اور انگریز کی بنائی ہوئی "لازاد شریعت" کو اب منسوخ کرنا چاہیے۔ اب اس ملک کا ہر قانون شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون بنائے۔ اب اگر کوئی مسودہ قانون شریعت کے خلاف یہاں کی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا تو وہ از روئے دستور رد کر دیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا قانون پاس ہو ہی جائے تو اس کے خلاف عدالت میں دہلوی دائر کر کے اس قانون کو منسوخ کرایا جائے گا۔

چوتھی شق کی تشریح :-

اسلامی حکومت کی عام پالیسی

کسی نظام کا انحصار صرف قانون پر نہیں ہوتا، بلکہ اس عام پالیسی پر ہوتا ہے جس پر نظام حکومت کو چلایا جاتا ہے۔ حکومت کو تعلیم و تربیت کے لیے ایک نظام بنانا ہوگا، وہ نوج اور پولیس کی تربیت کے لیے کوئی پالیسی اختیار کرے گی، وہ مالیات کا نظام چلانے کے لیے کوئی خاص نقشہ کار تجویز کرے گی، وہ صلح و جنگ اور بین الاقوامی تجارت، اور سفارتی و معاہداتی تعلقات کے لیے کوئی خاص روش اپناتے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت یہ سارے کام اُن حدود کے اندر کرے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اگر ہماری حکومت اپنے اختیارات کو مختلف داخلی و خارجی معاملات میں اسلام کی مرضی کے خلاف استعمال کرے تو اسلامی قانون کا اہتمام

بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس حق کو بھی اپنے مطالبہ میں شامل کر دیا ہے تاکہ اگر اسلامی حدود سے باہر جا کر کوئی پالیسی اختیار کی جائے تو اس کے خلاف بھی عدالت میں دعوے دائر کر کے اُسے بدلوایا جاسکے۔

تہدیلی کا نقطہ آغاز

میرے خیال میں اس تشریح کے بعد ”مطالبہ“ کا ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ کسی اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے سب سے پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے جس کا تقاضا اس مطالبہ میں کیا گیا ہے۔ پس اگر ہم اپنے ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں حکومت سے اس مطالبہ کو منوانا چاہیے۔ اور اگر اس مطالبہ کو مان لیا جائے تو دوسرا قدم یہ ہوگا کہ ایسے اہل علم کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ دستور (Constitution) اور قانون (Law) دونوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ وہ باہم سرچوڑ کر پیش اور پرٹے کریں کہ قرآن و حدیث کی رو سے وہ کون سے اصول ہیں جنہیں پاکستان کا بنیادی قانون قرار پانا چاہیے۔ اور خلافت راشدہ سے وہ کون کون سی باتیں حاصل ہوتی ہیں جن کو نظائر (Precedents) کی حیثیت سے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ تو اب ہر حال بعد کا ہے، اور جب اس کا وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت تو جس کے اہم معاملہ یہی ہے کہ حکومت پاکستان اپنے دستور کی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اس لیے اگر پاکستان کے لوگ فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا نظام حکومت اسلامی ہوتا رہے تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیں۔ یہ میرا کسی پارٹی کا مطالبہ نہیں ہے، اس میں کسی شخص کو ”شیخ الاسلام“ بنانے کا یا کسی خاص فرقے کے علماء کو جہاد گوانے کا، یا کسی خاص سیاسی پارٹی کے حقوق منوانے کا کوئی سوال شامل نہیں ہے، بلکہ یہ مطالبہ پوری امت کا ایک عام اجتماعی مطالبہ ہے۔

مطالبہ کیوں؟

اس مطالبہ کی ضرورت اس لیے پیش آتی کہ یہاں ایک معنوی انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوتا ہوتا تو اس مطالبہ کی ضرورت

پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے ساتھ ہی آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی۔ لیکن بحالات موجودہ ایک مصنوعی انقلاب کے بعد جتنا اس امر کا امکان ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے، اتنا ہی اس امر کا بھی امکان ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام اس ملک پر مستطرد دیا جائے۔ اس لیے اسلامی نظام اب ایک منظم اور پُر زور مطالبے ہی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس مطالبے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں وہ ایک مدت سے متفاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر یہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ کیا جائے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ (Secular Democratic State) قائم کیا جائے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی۔ اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں یا سی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا نہ مسلمان مسلمان، بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا ہم معنی ہے اور کبھی ”اسلامی سوشلزم“ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ اسلامی سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی یہ اسلامی جمہوریت کا بھی چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے بیٹے ہیں کہ اگر موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو آپ کافر ہیں کہ لوگ جس معنی میں اسلامی نظام کے خواہشمند ہیں، آپ اُسی معنی میں اُسے قائم کریں، آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

مطالبہ کرنے کی دوسری وجہ

پھر یہ مطالبہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار دیئے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو اسی حلاف اسلام طریق پر استعمال کر رہے ہیں جو قوم کو اسلام سے ہٹا کر غیر اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر فی الواقع عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنہوں نے مغربی

اصولوں کو اپنے نیسے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنے یہ خود بگڑے ہیں، اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ ان اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیئے ہیں۔ اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ ہمارے ایک فوجی بھائی کا خط ہے جو اخبار ”کوثر“ لاہور کے ۷ فروری ۱۹۴۷ء کے پرچم میں، اور ”جہان نو“ کراچی کی ۹ اپریل کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

(خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں مٹری آفیسرز کے ایک تفریحی مجمع کا افسوسناک نقشہ مذکور تھا۔ جہاں کنگ جارج اور قائد اعظم کے جامِ صحت کے طور پر شراب پی گئی، ماتحت افسروں کو بیویوں کے بے پردہ کرنے کی تلقین کی گئی اور اس کو ترقی منصب کا لازمہ قرار دیا گیا، ”غاز“ کو فوجی ذائقے کے مقابلہ میں متوجہ رکھنے کے لیے ریا رک دیتے گئے۔)

یہ ایک مثال ہے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے روز آ رہی ہیں ایک جگہ ایک چہرہ اسی ناز کے لیے گیا تو اسے ڈانٹا گیا۔ لاہور کے میڈیکل کالج کا واقعہ ہے کہ لڑھکا کا ایک طالب علم جس نے جو کس ایان کے تقاضے سے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی تھی، جب کالج میں داخلہ کے لیے گیا تو پرنسپل صاحب نے اسٹریو میں فرمایا کہ تمہارے چہرے پر ڈاڑھی ہے، تم کسی مسجد میں جا کر ملاؤ بن جاؤ، کالج سے تمہیں کیا واسطہ؟ ”جہان نو“ کی ۹ اپریل کی اشاعت میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ فوج میں ڈاڑھیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری فوج کے ان اعلیٰ اہلکاروں کو کبھی کسی سیکھ پر بھی اس قسم کے اعتراض کرنے یا اس طرح کی پابندیاں لگانے کی جرأت ہوتی تھی؟ میں نے یہ اخبار جس میں ہمارے فوجی بھائی کا خط چھپا ہے، یہاں کراچی بھیجا، اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوا یا کہ وہ حکومت سے پوچھیں کہ کیا یہ گورنمنٹ کی پالیسی ہے یا محض افسرانِ حکومت کی ذاتی روش ہے؟ لیکن

کوئی شخص اس سوال کو اٹھانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے یا کم از کم اس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا چاہتے ہیں۔

”دلیل محذرت“ کی ضرورت

ہم اس مطالبے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ ہمارے یہ رہنما انگریز کے شاگرد ہیں۔ اگر یہ دلیل سے ماننے والے ہوتے تو ایک آدمی کا کہہ دینا کافی ہوتا۔ لیکن یہ اس طرح سے ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک اس کے پیچھے ثبوت نہ ہو۔ ہم نے خود اس مطالبہ کو بھی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوا کر حالت کو جانچنے کی کوشش کی ہے، اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی رکن اسے دستور ساز اسمبلی میں خود بحث کے لیے پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب ہم اس مطالبے کو لے کر قوم کے سامنے آتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کو اسلامی حکومت درکار ہے یا نظام کفر؟

منظم اور متحدہ مطالبہ

میں مسلمانوں کے تمام گرد ہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گرد ہوں کا سوال نہیں ہے، بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہم سب اُس کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔ اس لیے آپ اپنے مارے اختلافات کو بھول جاسیے۔ آپ اگر آرام سے بیٹھے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لیے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجیے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منوانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اٹھائیے اور جن صحیح اور مؤثر تدابیر کو آپ نے اُس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے، اُن سب کو نظام اسلامی کے مطالبہ کے لیے بھی اختیار کیجیے۔ یہ مطالبہ بھی منصافانہ کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر

کے آپ یہ ثابت کر دیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لیے جلسے کیجیے، اس کے لیے ریڈیو موشن پاس کیجیے، اس کے پوسٹر آویزاں کیجیے، اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں لکھوائیے، اسے اپنی خط و کتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرا لیئے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے نیچے نیچے کی زبان پر چڑھ جائیں۔

مسلم لیگی بھائیوں کی ذمہ داری

میں اپنے مسلم لیگی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آپ نے پاکستان اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے مانگا تھا، آپ نے سب کچھ اسلام کے نام پر کیا، اب آپ آزمائش میں ڈالی دیئے گئے ہیں۔ اس آزمائش پر آپ پورے اُترنا چاہتے ہیں تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیے، اسے ابتدائی مسلم لیگوں سے پاس کرا لیئے، پھر صوبائی مسلم لیگوں کے سامنے یہ مسئلہ لائیے اور پھر جو لوگ اس مطالبے سے متفق نہ ہوں، انہیں لیگ سے باہر نکالی دیجیے۔ اب اشتراکیوں اور ملحد قسم کے لوگوں کے مسلم لیگ پر قابض رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہو جائیں تو پھر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا بلکہ دونوں قریب قریب ایک ہو جاتی ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض

میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کو محسوس کریں۔ اُن پر اس مسئلہ میں بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کسی ملک کی قوت لوہا اور کوئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ہی اس کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ آپ حضرات قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کو اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالنا ہے؟ اگر آپ کو اپنے المیہ ان کے لیے دلائل و کار میں تو ہم آپ کے تمام شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے تیار ہیں اور آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں کہ آپ کی، آپ کی قوم کی، بلکہ پوری دنیا کی فلاح اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ اگر آپ اس پر مطمئن ہو چکے ہیں تو آپ کی ساری قوتیں اور طاقتیں

اس کی تائید میں صرف ہونی چاہئیں۔ پہلے پاکستان بننے کا مقصد بھی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک آپ نے اپنا سارا اعتدال اس پلڑے میں نہیں ڈالا۔ اب نظام اسلامی قائم کرنے کا مقصد بھی اسی وقت پورا ہوگا جب کہ آپ اپنا پورا اعتدال اس پلڑے میں ڈال دیں گے۔

علماء و مشائخ سے گزارش

میں علماء اور مشائخ سے بھی کہتا ہوں کہ براہ کرم جتنی اختلافات کو چھوڑ دیجئے اور اپنی ساری کوششیں اس کام پر مرکوز کر دیجئے۔ اگر یہ اصلاح ہوگئی تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں غیر اسلامی نظام نافذ ہو جاتا ہے تو ایک کر کے اس میں سے اسلام کے سارے نشانات مٹ جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جس نے مسلمان ہوتے ہوئے حج کو برسوں ممنوع رکھا، قرآن کے قوانین کو منسوخ کر کے اُن کے بجائے دوسرے قوانین بنائے، قرآن مجید نے عورت کا حصہ وراثت میں مرد سے اُدھار رکھا ہے اُس نے ازدواجی قانون عورت کا حصہ مرد کے برابر کر دیا۔ ہمارے ملک میں اب تک اسلام سے جو رعایات روارکھی گئی ہیں اور جو نرمی کا سلوک اس سے کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ مذہب کے معاملہ میں ذرا ڈھیل دے دے۔ لیکن اگر آپ کے اپنے دوٹوں سے یہاں لادینی حکومت قائم ہوگئی تو پھر اسلام کا نشان اس ملک میں باقی نہ چھوڑا جائے گا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اسی دنیا میں ایک مسلمان ملک کی حکومت ایسی بھی ہے جس نے لادینی نظام قائم کرنے کے بعد دینی تعلیم کو قانون کی طاقت سے حرام کر دیا ہے۔ اس لیے آپ اب جزئیات اور فروعات کو معمول جاسیتے اور ساری قوت اس کام پر اور اس بنیادی اصول کو منوانے پر صرف کر دیجیے کہ یہاں کا نظام اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں اسلامی ہوگا۔

یہ جو کبھی کہا جاتا ہے کہ شراب بند کی جائے، کبھی یہ کہ زنا کے اڈے اڑا دیئے جائیں۔۔۔ تو یہ کام تو کانگریسی حکومت بھی کرتی رہی ہے۔ کیا ان کاموں کے کرنے

سے کوئی حکومت اسلامی حکومت ہو جاتے گی؟ پھر کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کیا جاتے جس میں زکوٰۃ کی وصولی اور صرف کاشتکاروں کا کیا جاتے۔ لیکن یہ تو وہ حقوق ہیں جو کبھی ہم نے اپنی اسلامی حکومتوں میں اپنے ہاں کے ذمیوں کو دیتے تھے، اور جو امریکہ، روس، فرانس اور یوگوسلاویہ، بلکہ روسی ترکستان ملک کی حکومتوں نے اپنی مسلمان رعایا کو دے رکھے ہیں۔ کیا ان باتوں سے کوئی نظام حکومت اسلامی نظام میں بدل جاتا ہے؟

جزئی مطالبات چھوڑ دیجیے

ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں، جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظام تعلیم اور نظام عدالت اور پورے کاپورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں داخل جاتے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بیت المال تو علماء کی تحویل میں ہے اور مالیات کا نظام غیر اسلامی ہاتھوں میں رہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ملک کا پورا خزانہ اسلامی بیت المال میں بدل جائے۔ لہذا براہ کرم آپ حضرات چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ مانگیں، ورنہ ایسی دو ایک چیزیں دے کر آپ کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ پھر اگر آپ اس کے بعد کوئی اور جزئی مطالبات سامنے لائیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ ملا لوگ نہایت نامعقول ہیں، ان کے مطالبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور یہ ملک کی ترقی اور استحکام کے راستے میں خواہ مخواہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ پس آپ اپنی ساری قوت اس بنیادی مطالبے کے منوانے پر صرف کیجیے جس کے اندر آپ کے سارے مطالبات مضمر ہیں۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو تنبیہ

اب میں کچھ باتیں اپنے ملک کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات نے ناجائز طریقوں سے جو کچھ سمیٹ رکھا ہے، اسے تو اب بہر حال جانا ہے۔ سرمایہ پرستانہ طور طریقوں کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب روپے کی خدائی کا تخت متسزل ہو رہا ہے۔ اب دوسروں کی محنتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اسراف اور عیاشی کی زندگی کے لیے دوسروں کی کمائیوں میں سے سرمائے کے زور پر اپنے حق سے زائد وصول کرنے کا سلسلہ بہر حال ختم ہونا ہے۔ ان چیزوں کو ختم کرنے کے لیے آپ دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو پسند کر لیجیے۔ ایک ہاتھ وہ ہے جو

اُپ کے خود ساختہ حقوق اور اعزازات کے ساتھ خود اُپ کو بھی مٹا دے گا اور دوسرا ہاتھ ہے جو جب بھی اُٹھے گا، انتقام کے لیے نہیں، انصاف کے لیے اُٹھے گا، اور وہ اُپ سے صرف اتنا ہی چھینے گا جو اُپ نے ناجائز طور پر سمیٹ رکھا ہے۔ اگر اُپ نے انصاف کرنے والے خدا پرست ہاتھ کو پسند نہ کیا تو پھر یہاں دوسرا انتقامی ہاتھ بھی بہر حال دراز دستی کے لیے موجود ہے اور وہ اپنا کام کر کے رہے گا۔

مزدوروں اور کسانوں سے اپیل

اسی طرح میں اپنے ملک کے مزدوروں اور کسانوں سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ آدمی صرف روٹی کے لیے نہیں جیتا، آدمی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز آدمیت ہے۔ اگر اُپ کو کوئی ایسا نظام ملے جو اُپ کے لیے روٹیوں کا توازن قائم کر دے، اگر اُپ کی آدمیت کو ختم کر دے تو اسے ہرگز قبول نہ کیجیے۔ ایک نظام ایسا بھی موجود ہے جو اُپ کو روٹی بھی دیتا ہے اور اُپ کی آدمیت کا بھی انتظام کرتا ہے۔ وہ اُپ کے مسئلے بھی حل کرتا ہے اور اُپ کو روحانیت اور انسانیت کے مدارج بھی ملے کرتا ہے۔

مسلم عوام سے خطاب

اب میں مسلمان عوام سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اُپ کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام کیا ہے۔ اگر اُپ اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نام لے کر اُپ کو کفر کی طرف دھکیل دیا جائے، شراب کی بوتل پر مشربت کا لیل لگا کر اسے اُپ کے ہاتھ فروخت کیا جائے اور اُپ اسے پک کر لے لیں، یہاں ایک غیر اسلامی نظام قائم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ نمائشی چیزیں اسلام کی شامل کر دی جائیں اور اُپ ان نمائشی چیزوں سے دھوکا کھا کر مطمئن ہو جائیں کہ بس اب اسلامی نظام قائم ہو گیا۔

ہم نے اپنی ساری قوت اس مقصد پر لگا دینی کہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ملک کے عوام میں صحیح اسلامی شعور بیدار ہو۔ ہم اُن کو جھنڈوں اور جلوسوں اور جذباتی نعروں سے ایک کھوکھلے اشتعال میں مبتلا کرنے کا طریق کار صحیح نہیں سمجھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اندھے جذبات کی رو میں بہنے لگیں۔ بلکہ ہم ان کے اندر اسلام کے لیے جینے اور مرنے کا شعوری دلولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پر ایک حقیقت ہے کہ اگر ہمارے ملک کی حکومت کے لیے ایک ایسا دستور بنادیا جائے جو مو فیصدی اسلامی ہو، لیکن اس کی پشت پر اسلامی سوسائٹی نہ ہو تو وہ اسلامی دستور کوئی حقیقی نتیجہ نہیں دکھا سکتا اور نہ اس کے بل پر اسلامی نظام چل سکتا ہے۔ کوئی دستور کاغذ کے اوراق پر نہیں چلا کرتا، بلکہ اس کا بننا اور اس کا کام کرنا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ ملک کے عوام کی کتنی منظم طاقت اس کو چلانے کا حزم رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کو اپنے دین اور مسلک زندگی کے طور پر پسند کرتے ہیں وہ ہمارا ساتھ دیں اور دین کی خدمت کے لیے منظم ہوں۔

اب میں اُن عذرات کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا جو وہ طبقہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے جو اسلامی نظام کو پسند نہیں کرتا اور اس کے قیام کا مخالف ہے۔

استحکام پاکستان کا عذر

ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نوزائیدہ حکومت ابھی ابھی بنی ہے اور جی نہیں ہے۔ سرحد پر چاروں طرف سے خطرہ ہے۔ بس اس وقت ساری طاقت پاکستان کو مضبوط کرنے میں صرف ہونی چاہیے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے کام کو ملتوی رکھنا چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ پاکستان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اس میں رہتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے لیے اصل خطرہ کہاں ہے؟ — اس کے اندر یا باہر؟ میں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے ہے، اس لیے کہ اس گشتی کے طالع دن رات اس میں پھید کرتے رہتے ہیں۔ ان کی رشوت خوردی اور عورت پروریوں پاکستان کو مسلسل کمزور کر رہی ہیں۔ جن نازک حالات کا دفنا یہ دن رات خود رشتے ہیں ان میں جو حرکات یہ لوگ خود کر رہے ہیں انہیں دیکھو دیکھو کہ اکثر مسلمان یہ کہتے سُننے جاتے ہیں کہ اگر پاکستان میں بھی یہی کچھ ہونا تھا تو ہم ہندوستان میں کیا بُرے ہتھے، کتنے ہی مظلوم ہاجر یہ سوال کرتے پاتے گتے ہیں کہ کیا پاکستان ان ہی مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے؟ یہ چیزیں ہمارے عوام کا دل توڑنے والی اور ان کے جذبات کو سرد کرنے والی ہیں۔

پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے مزدی ہے کہ اس کے ایک ایک نوجوان اور ایک ایک نوجوی سپاہی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ جب وہ لڑے گا تو محض زمین کے

لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے لڑے گا اور اگر وہ جان دے گا تو قوم کے کچھ لیڈروں اور عہدیداروں کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے دین کے لیے دے گا۔ اگر آپ اپنے ہر فوجی کو اس بات پر مطمئن کر دیں کہ تیری خدمات صرف اسلام کے لیے حاصل کی گئی ہیں تو پھر دیکھیے کہ وہ کس جرات اور دلیری سے لڑتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں اور اپنے سپاہیوں کے دلوں کو اطمینان دلانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں رکھتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا صاف صاف دستوری اعلان کر دیں۔ پھر کون معقول آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ جو چیز ہم پیش کر رہے ہیں وہ پاکستان کو مستحکم کرنے والی ہے اور عین اس کے استحکام ہی کے لیے اس کو کامیاب بنانے کی ضرورت ہے۔

انتشار انگیز عصبيتیں

پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف عناصر اور مختلف صوبے متحد ہو کر ایک بنیاد پر مبنی بن جائیں۔ لیکن جن اصولوں پر ہم آج تک کام کرتے آئے ہیں ان کا قدرتی نتیجہ یہ نمودار ہو رہا ہے کہ ہر گروہ جو اپنا کوئی مختلف مفاد رکھتا ہے وہ ایک جداگانہ عصبيت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بے اصول قومی وحدت پیدا کرنے والی مغربی سیاست کے زہر کا اثر ہے کہ اب ایک پاکستان میں ایک مسلمان قوم نہیں بلکہ پانچ علاقائی قومیں بن گئی ہیں: سندھی، بلوچی، پنجابی، افغانی اور بنگالی! ان سب کو یکجا کر کے بنیاد پر مبنی صرف اسلام ہی کے ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

پھر یہاں "انصار" اور "مہاجرین" کی باہمی کشمکش کے سبب سے ان کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں اور دو الگ الگ ریاستیں رونما ہو رہی ہیں۔ اور اگر حالات اسی رفتار پر رہے اور ان کا کوئی سد باب نہ کیا گیا تو یہ مسئلہ بھی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن

۱۔ یہ الفاظ طنزیہ استعمال کیے گئے ہیں۔ در نہ اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے نہ مقامیوں نے کبھی "انصار" کا سادو یہ اختیار کیا اور نہ ہندوستان سے آنے والوں نے مہاجرین کا سادو یہ والا

ماشاء اللہ۔ (جدید)

کے موجود رہے گا۔ آپ اس واقعہ سے خطرہ کا اندازہ کیجیے کہ مشرق پنجاب سے آئی ہوئی ایک برادری کو جب مغربی پنجاب کی سرحد پر آباد کیا گیا تو وہاں کے مقامی باشندوں نے سکون کو دعوت دے کر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ متضاد عنصر پاکستان کے لیے اس وقت تک خطرہ ہیں جب تک ان کے درمیان عصبتیں کام کرتی رہیں۔ ان کو اگر یا ہم جوڑا جاسکتا ہے تو اسلامی نظام کی فضا میں اسلامی اصولوں کے ذریعہ ہی جوڑا جاسکتا ہے، ورنہ ان کے ہر وقت متضاد ہوجانے کا امکان ہے۔

مسئلہ مہاجرین کا واحد حل

اگر پاکستان حاصل ہونے سے پہلے ہمارے لیٹروں نے قوم کے اخلاق کی صحیح تعمیر اسلامی اصول پر کر لی ہوتی تو مہاجرین واقعی "مہاجرین" ہوتے اور انصار واقعی "انصار" پھر ان کا مسئلہ حل کرنے میں ہمیں وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آج دن سامنے پیش ہیں۔ قوم میں اسلامی عصب بیدار ہوتی تو یہاں کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مشرقی پنجاب کے مظلوموں کا استقبال کرتے، خود زمین پر سوتے اور اپنے بستر اور چٹنگ آنے والوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ مسئلہ کوئی آج ہی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی اچھا ہے۔ مدینہ کی چوٹی سی بستی نے مکہ اور عرب کے مختلف قبائل کے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو اس صبر و سکون سے جذب کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ اہل مدینہ کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہے، درآنحالیکہ اس زمانے میں تمدنی ذرائع و وسائل بہت ہی ابتدائی حالت میں تھے۔ وہاں بھی اس مسئلہ کو اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاق نے حل کیا تھا اور یہاں بھی اس گنتی کا واحد حل یہی ہے۔

اب یہ بات ہر شخص کے خود سوچنے کی ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنے والی شے وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں یا وہ ہے جو اس کے خلاف کی جا رہی ہے؟

ہندوستان میں ہندو حکومت کے قیام کا خدشہ

دوسرا غدیہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی تو ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ہندو حکومت قائم نہیں ہو چکی؟ کاغذ پر کہا جا رہا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت کا کوئی مذہب نہیں اور اس میں سب کو

برابر کے حقوق حاصل ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو زمین پر چلنے کے بھی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس لیے آپ وہاں کی فکر نہ کریں، وہاں تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے وہ اسی لیے پہنچا ہے کہ ہم اسلام کا نام تو لیتے ہیں لیکن اسے اپنی زندگی کا دستور العمل نہیں بناتے۔ اگر یہاں ایک مرتبہ اسلامی نظام قائم ہو جائے جو بے لوث انصاف کے بل پر چلے اور یہاں کی حکومت وعدے کی کھری ہو، اور اپنے طریقہ عمل سے ثابت کر دے کہ اس کے تمام معاملات عدل و انصاف اور صداقت و یقین پر مبنی ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت جاگ اُٹھے بلکہ خود ہندوستان کی قسمت بھی بدل جائے۔ آخر پہلے یہ ہندوستان کے مسلمان کہاں سے آئے تھے؟ یہیں کے ہندو ہی تو زیادہ تر مسلمان ہوئے تھے۔ تو پھر آج بھی اگر آپ دکھا دیں کہ اسلام سے ملک کا انتظام کیسا درست ہوتا ہے، معاشی اور معاشرتی نظام کتنے صالح ہو جاتے ہیں، پالیسی کتنی بے لگ ہوئی ہے تو ہندوستان کے لوگ سوچنے لگیں گے کہ آخر کیوں نہ ہم بھی اس نظام کو اختیار کر لیں۔ وہ آپ کے دشمن تو ہو سکتے ہیں، مگر اپنے تو دشمن نہیں ہیں۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہماری اٹھ سو سالہ تاریخ جس پر خط نسخ پھر گیا ہے، از سر نو زندہ کی جاسکتی ہے۔

ہندو اقلیت کا عذر

پھر یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اسلام کی حکومت کو ہندو اقلیت کیسے گوارا کر لے گی۔ یہ عذر بھی اہل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سرحد اسمبلی میں کوٹورام نے ایک ریزولوشن پیش کیا ہے جس میں سرحد اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو صوبہ سرحد کے عوام کی اس خواہش سے آگاہ کرے کہ وہ پاکستان میں اس نظام حیات کو جلد از جلد نافذ کرانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد قرآن کے قوانین پر ہے اور یہ نظام یقیناً دنیا کے لیے ایک قابل تقلید مثال ثابت ہوگا۔

چند ہی روز پہلے میرے پاس عداس سے ایک خط آیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ”اسلام کا نظریہ سیاسی“ اور ”معاشرتی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل“ (میرے دور رسالے) پڑھنے کے بعد ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ ہم پر یہ چیز بھی واضح نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اس طرح کا صالح نظام

حیات قائم کیا جائے گا۔ اگر مشر جناب اس چیز کی وضاحت فرمادیتے تو کوئی ذی فہم انسان اس کی مخالفت نہ کرتا۔

غیر مسلم اقلیتوں سے اپیل

قاہم مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے بہت سے غیر مسلم حضرات اس سے گھبرائے ہیں کہ وہ ایک ایسی حکومت کے فرمانبردار کیسے ہو سکتے ہیں جو ایک مذہب کی پابند ہو۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے غیر مسلم بھائی ایک چیز کو بعض نہ جاننے کی وجہ سے اُس سے اختلاف کر رہے ہیں، حالانکہ یہ صحیح معنوں میں وہی چیز ہے جسے گاندھی جی "رام راجہ" کہتے تھے اور ہمارے عیسائی بھائی "آسمانی بادشاہت" کہتے ہیں۔ ہم اپنے ہندوستانی ہندو بھائیوں کے شکر گزار ہوں گے، اگر وہ ہندوستان میں حقیقی رام راجہ قائم کر دیں، اس رام راجہ میں بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت موجودہ لادینی حکومت کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریق سے ہوگی۔ میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی تو ان کے حقوق بالکل محفوظ ہوں گے اور زمین پر بھی ان کو وہی حقوق دیتے جاقیم گے جو کاغذ پر ہوں گے۔ لیکن اگر یہاں جمہوریت کی لادینی حکومت قائم ہوتی تو یہ مسلمانوں کی "قومی حکومت" ہوگی جس میں اکثریت اپنی مرضی کے مطابق اپنے ملک سے قومی تعصبات کے ساتھ من مانی کا سودا بیاں کرے گی۔ اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی صورت میں جو حقوق اسلام میں آپ کے لیے مقرر ہیں، مسلمانوں کو اور ان کی حکومت کو اس کا اختیار ہی نہیں ہے گا کہ وہ ان میں کمی بیشی کریں۔ یہاں کا مسلمان اپنے اخلاقی طرز عمل کو انٹین یونین کے یا دنیا کی کسی اور غیر مسلم قوم یا حکومت کے رویے کو دیکھ دیکھ کر نہیں بدلتے گا، بلکہ اس کا طرز فکر یہ ہوگا کہ دوسری قومیں اور حکومتیں اگر اپنے عہد کو لٹکتی ہیں تو توڑ دیں، میں مسلمان ہو کر اپنے عہد کو کیسے توڑ سکتا ہوں۔

یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ صدیات میں اگر کسی نے یہاں غیر مسلموں کو ظلم سے بچانے کی کوئی بے غرضانہ کوشش کی ہے تو وہ دیندار لوگ ہی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں ان کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی ان کی خدا خونی اور انسانی ہمدردی نے انہیں زیادتی اور ظلم سے نہ صرف باز رکھا، بلکہ انہوں نے حتی الامکان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو پناہ دی اور محفوظ مقامات تک پہنچایا اور اس کام میں اپنی جان ابدال کی ذرا پروا نہ کی۔ ہمارے پاس ایسے بہت سے واقعات

نہ صرف یہ کہ ریکارڈ ہے، بلکہ خود غیر مسلم حضرات کے متعدد اعترافی خطوط ہم تک پہنچے ہیں اور ہندوستان جانے والے غیر مسلموں میں سے ہزاروں اس کی گواہی دیں گے۔
اسلامی حکومت کی گارنٹی

اسلامی حکومت کی صورت میں یہاں جو گارنٹی دیکھائے گی وہ ہماری طرف سے نہیں، بلکہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہوگی۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں کہ جو ذمہ دیکر پھر خلافت مجدد کرے قیامت کے روز میں خود اس کی خلافت مدعی ہوں گا اور وہ جنت کی بھی نہ سونگے گا۔ پھر حضورؐ کی آخری وصیت میں جہاں نماز اور عہدوں کے حقوق کی تاکید تھی، وہاں ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی حکم تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب مسلمان فوج ایک جگہ سے پسپا ہونے پر مجبور ہوئی تو انہوں نے غیر مسلموں کو بلا کر ان کے ٹیکس واپس کر دیئے کہ ہم نے یہ ٹیکس آپ کی مخالفت کی ذمہ داری کے معارف کے طور پر لیے تھے اور چونکہ اب ہم مخالفت کی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اس رقم پر بھی اب ہمارا کوئی حق نہیں رہا جو تمہاری مخالفت کے لیے لی گئی تھی۔ میں غیر مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ یہ نظام آپ کے لیے رحمت ہو گا، آپ اس کے قائم کرنے میں ہمارا ساتھ دیجیے اور ہمیں مدد پہنچائیے۔ اسلامی نظام میں آپ کے لیے مغربی طرز کی بے یمنی جمہوریت کے مقابلے میں اتنی زیادہ برکات ہیں کہ اگر آپ کو ان کا اندازہ ہو تو آپ مغربی جمہوریت کی مخالفت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں۔

دنیا کی راستے عام کے بگڑ جانے کا ہتھول

یہ غلطی بھی کیا جاتا ہے کہ اگر ہم نے مذہبی حکومت قائم کی تو دنیا کی راستے عام ہمارے متعلق خراب ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی وجہ سے ہمیں اپنے اسلام پر ٹھہرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں اسلام پر اتنا بھی ایمان نہیں جتنا ۱۹۱۱ء میں روس کے کمیونسٹوں کو کمینوزم پر تھا۔ وہ لوگ جب جنگ سے نکلے تھے تو ملک کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی، سارا نظام ویدیم برہم تھا، ملک چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا، فوج شکست خوردہ اور صنعت و حرفت خستہ حال تھی، اور یہ بھی واضح تھا کہ اشتراکی نظام کے قیام کے ساتھ ہی دنیا کی ساری سرمایہ دار طاقتیں اس کے خلاف ہو جائیں گی۔ لیکن ان ساری باتوں کے علی الرغم انہوں نے یہ نظام قائم کیا اور اب ہر سرمایہ دار

طاقت اس سے لرزہ بر اندام ہے۔ ہمیں دوسروں کی طرف نہیں، اپنی طرف دیکھنا چاہیے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا کیا ہے۔ ہمیں اس تقاضے کو پورا کرنا چاہیے۔ دنیا کی رائے عام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق خراب ہوتی ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کو میدان عمل سے باہر رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے روشناس کر لیا ہے، چنانچہ اسلام بھی مضحکہ بن گیا اور مسلمان بھی۔ لیکن اب اگر ہم اسلام کو میدان عمل میں لاکر اسے پورا اقتدار دیدیں تو دنیا کی رائے عام مستقل طور پر اسلام کے بارے میں بھی درست ہو جائے گی اور ہم مسلمانوں کے بارے میں بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ ایک دو سال تک غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں، لیکن دو چار سال کے بعد وہ ہمارے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور تسلیم کریں گے کہ یہ لوگ تو ہمارے رہنما بننے کے قابل ہیں، کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر ایک جہانی ریاست (World State) بن سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے تجربے کو دیکھ کر ان کے دل آپ کے سامنے جھکنے نہ شروع ہو جائیں۔

”ملاقاتوں“ کی حکومت کا شبہ

ایک خندہ تو یہ بھی تراشا گیا ہے کہ اسلامی حکومت تو ”ملاقاتوں“ کی حکومت ہوگی اور ملاذیل کے معاملات کو کیا جانیں۔ میں اس خندہ کے گھڑنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے اس ”باد بان“ سے بھی ہوا نکال چکے ہیں۔ پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی نظام کے مطالبے کو لے کر کھڑے ہیں وہ ملاذیل نہیں ہیں بلکہ آپ کی طرح دنیا کے معاملات کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن و حدیث کو بھی! — اسلامی حکومت کے مطالبے کو لایمپالے لوگ جدید فلسفہ و سیاست کو بھی آپ بہتر طریقہ پر سمجھنے والے ہیں اور قرآن کے فلسفہ و سیاست سے بھی کوئی نہیں ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہوگی تو وہ اپنے چلانے کیلئے ایسے ہی آدمی طلب کریں جو موجودہ دور میں اسلامی اصول پر کام کر سکیں۔ ہمیں ملک کے باشندوں اور رائے دہندوں کو بتانا پڑے گا اور اس بارے میں ان کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ اسلامی حکومت کے لیے ایسے آدمی فراہم کریں۔ اگر آپ مندر کے انتظام کیلئے آدمی مطلوب ہوں تو لوگ دیسے ہی آدمی تلاش کر کے دیں گے، اور اگر مسجد کے انتظام کیلئے لاکھوں درکار ہوں تو وہی آدمی ان کے سامنے آئیں گے اور ایک بینک کا نظام چلانا ہو تو اس کی صلاحیت رکھنے والے آدمی ہی چنے جائیں گے۔ اسی طرح اگر اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے لاکھوں کی

مزدور ہوگی تو راستے عام اس کام کی صحیح صلاحیتیں رکھنے والوں کو چھانٹ کر آگے لانے لگے گی یہ سمجھا درست نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام کو چلا سکنے والے کارکنوں کا بالکل قحط ہے۔ ایسے آدمی موجود ہیں اور ملک ہی کے اندر نہیں، بلکہ خود آپ کی حکومت کے موجودہ پرنسپلز میں بھی اس میدان کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے۔

غیر اسلامی نظام میں اسلامی قانون

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ نظام تو غیر اسلامی رکھا جائے اور عدالتی قانون اسلام کا جاری کر دیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ پھر کیوں نہ ایک سکولر مسجد کا امام بنادیا جائے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ریاست تو اپنے آپ کو لاد مذہب کہے اور قانون وہ مذہب کا جاری کرے۔ مجھے اس رائے کے پیش کردہ سوالوں کی عقل پر رحم آتا ہے۔ ایک غیر اسلامی نظام کے تحت میں اسلامی قانون کا صحیح طور پر نشوونما پانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلامی قانون کا قیام واجرا نظام تعلیم اور معاشرتی باجلی کو لازم کے مطابق ڈھالے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اسلام لکھنؤ نظام اس کے معاشی اور معاشرتی نظاموں سے الگ ہو کر اور کسی دوسرے نظام کا جز بن کر نہ تو پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ وہ برگ و بار لے سکتا ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ یہ حرکت تو بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے آم کی ایک ٹہنی کو لیکر کے تنے پر پیوند کر دیا جائے۔ اس صورت میں اس ٹہنی سے آم ملنا تو کچا، دیر تک اس کا سرسبز رہنا بھی مشکل ہے۔ یہ پہلی باتیں اچھے خاصے تعلیمیافتہ لوگ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو اس ملک کے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ یہ بھی بات یہ ہے کہ آپ اگر اس ملک کو اسلام کے اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں تو پھر اس کا دستور لازماً اسلامی ہونا چاہیے۔

ان حضرات کے علاوہ اگر کوئی اور خدشہ بھی ہو تو ہم ان کو بھی سُنا چاہتے ہیں امدان کے جواب میں جو سوال ہمارے پاس ہوں گے ہم انہیں پیش کر کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ہماری خواہش یہ ہے کہ اس ملک کی راستے عام کو پوری طرح مطمئن کریں اور عوام الناس خوب اچھی طرح جان لیں کہ ان کی غلط فہمی اسی شے میں ہے کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔